For more books visit www.4Urdu.com
A-PDF Watermark DEMO: Purchase from www.A-PDF.com to remove the watermark

این۔ کول کا تذکرہ کیسے آ گیا؟" ہندوستانی افسر نے انہیں بتایا کہ میں بھی جموں میں کول کے کالج ہی میں پڑھ چکا ہوں۔ پنڈت جی مسکرائے اور بولے۔ "ان کو بھی تو کبھی کشمیر آنے کی دعوت دو۔ ہماری طرف سے خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ ہو گی۔"

URDU4U.COM

میں نے نہایت احترام سے گزارش کی۔ "سر' اگر آپ کی وجہ سے کشمیر کا مسئلہ ہی حل ہو جائے' تو اس سے بڑی خاطر تواضع اور کیا ہو سکتی ہے؟" یہ سنتے ہی پنڈت جی کے تیور بگڑ گئے' جیسے ان کے منہ میں زبردستی کڑوی گولیاں ٹھونس دی ہوں۔ انہوں نے بے اعتنائی سے گردن گھمائی اور منہ دوسری جانب موڑ کر بیٹھ گئے۔

مری میں صدر ایوب نے پنڈت جی کے ساتھ خاص خاطرداری سے کام لیا۔ لیکن اس تواضع اور تپاک نے بھارتی وزیراعظم کے دل میں جمی ہوئی سردمہری کی برف پر گرم جوشی کی ایک ہلکی سی آنچ بھی نہ ڈالی۔ صدر ایوب نے نقشوں کی مدد سے پاکستان کے لیے کشمیر کی دفاعی اور معاشیاتی اہمیت پر پوری پوری روشنی ڈالی اور کہا کہ پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستان کے مسلمہ لیڈر ہیں۔ پاکستان میں بھی لوگ میری بات سنتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم نے اپنی زندگی میں قضیہ کشمیر کا حل تلاش نہ کیا تو یہ موقعہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اور پھر شاید کبھی دوبارہ ایسا موقع ہاتھ نہ آئے۔

پنڈت جی نے صدر ایوب کی تمام باتیں نہایت توجہ اور انہماک سے سنیں۔ پھر سوچ سوچ' کر ایک ایک لفظ تول تول کر انہوں نے نہایت صاف گوئی سے اپنا موقف اس طرح واضح کیا کہ کشمیر کا مسئلہ بہت سی غیر معمولی پیچیدگیوں میں الجھا ہوا ہے۔ اسے جوں کا توں پڑا رہنے دیا جائے تو اسی میں ہم سب کی عافیت ہے کشمیر میں دو بار انتخابات منعقد ہو چکے ہیں۔ اب عنقریب تیسرا انتخاب بھی آنے والا ہے۔ وہاں پر حالات امن و امان کی فضا میں مستحکم ہو رہے ہیں۔ ان حالات کو دگرگوں کرنے کی کوشش کرنا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف ہو گا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اقلیت کو بھی ہرگز نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ انہیں ہندوستانی قوم میں ضم کرنے کا

For more books visit www.4Urdu.com

عمل جاری ہے۔ اگر کشمیر میں موجودہ صورت حال کو الٹ پلٹ کیا گیا' تو اس عمل میں شدید رکاوٹ پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ دوسرے الفاظ میں پنڈت نہرو نے صدر ایوب کے سامنے ہندوستانی مسلمانوں کو مسئلہ کشمیر کا یرغمالی بنا کے بٹھا دیا یعنی اگر مسئلہ کشمیر کو از سر نو چھیڑنے کی کوشش کی گئی تو سارے ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ صدر ایوب کے پاس اس کھلی دھمکی اور انوکھی منطق کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس لیے وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اور اس طرح مری کی سات ہزار فٹ کی بلندی پر مسئلہ کشمیر ایک بار پھر برفدان میں ڈال کر سربمہر کر دیا گیا۔

کشمیر کے معاملے میں پنڈت نہرو کی خواہشات اور عزائم نے ایک نیا گل اس وقت کھلایا' جب ۱۹۶۴ء میں شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ پاکستان کے دورے پر تشریف لائے۔ ان دنوں میں ہالینڈ میں بطور سفیر متعین تھا۔ میری واپسی کے بعد ایک بار مجھے صدر ایوب نے خود بتایا کہ چکلالہ کے ہوائی اڈے پر اترتے ہی انہوں نے پے در پے ایسے بیانات دینا شروع کر دیئے ہیں جن میں بھارت کی نام نہاد سیکولرزم' دوستی اور امن پسندی کی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف کا پرچار تھا۔ اس کے علاوہ ان دونوں حضرات نے پنڈت نہرو کے گن گا گا کر برملا یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ تین آزاد ممالک یعنی ہندوستان' پاکستان اور کشمیر کی ایک کنفیڈریشن بنانا ہی ہمارے تمام مسائل کا واحد حل ہے۔ صدر ایوب کا کہنا تھا کہ یہ سن کر وہ ان دونوں سے بے حد مایوس ہوئے اور ان سے کہا کہ اگر آپ ہندوستان کی طرف سے یہی مشن لے کر آئے ہیں' تو آپ سے کسی معاملے میں کوئی سنجیدہ گفتگو کرنا بے کار ہے۔ البتہ آپ ہمارے معزز مہمان ہیں۔ جہاں جی چاہے خوشی سے گھومئے پھریئے' جس کے ساتھ جی چاہے آزادی سے ملئے جلئے۔ ہماری طرف سے آپ کے لیے ہر طرح کی سہولت حاضر ہے۔

شیخ عبداللہ اور مرزا فضل بیگ پاکستان کے دورے پر ہی تھے کہ پنڈت جواہر لال نہرو دہلی میں سرگباش ہو گئے۔ اگر واقعی کنفیڈریشن کا خناس ان کے ذہن میں سمایا ہوا تھا تو یہ فتنہ بھی ان کی موت کے ساتھ اپنے آپ ختم ہو گیا۔

For more books visit www.4Urdu.com

مری میں قیام کے دوران پنڈت نہرو نے صدر ایوب سے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ چین کے ساتھ کسی قسم کی سرحدی معاہدہ طے کرنے کے لیے گفت و شنید کر

URDU4U.COM

رہے ہیں؟ صدر ایوب نے سچ سچ بتا دیا کہ اس موضوع پر بات چیت ضرور ہو رہی ہے' لیکن یہ معاملہ ابھی تک بالکل ابتدائی مراحل میں ہے۔ پنڈت جی نے اپنی شاطرانہ چال کو ہمدردانہ لہجے میں لپیٹ کر وہ نقشہ دیکھنے کی فرمائش کی جس کی بنیاد پر ہم چین کے ساتھ اپنی سرحدیں طے کرنا چاہتے ہیں۔ صدر ایوب نے بغیر سوچے سمجھے انتہائی سادہ لوحی سے متعلقہ نقشہ کھول کر ان کے سامنے بچھا دیا۔ پنڈت جی نے ایک اور داؤ کھیلا اور درخواست کی کہ کیا آپ اس نقشے کی ایک نقل مجھے عطا فرما سکتے ہیں۔ صدر ایوب نے پھر بغیر سوچے سمجھے سادہ لوحی سے فوراً حامی بھر لی۔ ان دونوں کے درمیان یہ گفتگو سراسر ذاتی' غیر رسمی اور دوستانہ سطح پر ہوئی تھی لیکن دہلی واپس پہنچتے ہی پنڈت نہرو نے بات کا بتنگڑ بنا ڈالا' اور چین اور پاکستان کے مابین سرحدی گفت و شنید کو ملی بھگت قرار دے کر اس کے خلاف کڑی تنقید شروع کر دی ساتھ ہی سرکاری سطح پر بھارتی حکومت نے احتجاجی انداز میں وہ نقشہ بھی طلب کر لیا جس کی بنیاد پر پاکستان چین کے ساتھ اپنے سرحدی معاملات طے کرنا چاہتا تھا یہاں پر ہماری متعلقہ وزارتوں کا مشورہ تھا کہ بھارت کا یہ رویہ ناجائز ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے انہیں نقشہ فراہم کرنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن صدر ایوب مصر تھے کہ انہوں نے پنڈت نہرو سے وعدہ کر لیا ہے' اور اب وہ اس معاملے میں کسی قسم کی وعدہ خلافی بالکل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مجبوراً' مطلوبہ نقشے کی نقل سرکاری طور پر بھارتی حکومت کو ارسال کر دی گئی۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی تمام چالبازیوں' قلابازیوں' وعدہ خلافیوں اور ہٹ دھرمیوں کے باوجود غالباً صدر ایوب کے دل میں امید کی یہ کرن ٹمٹماتی رہی کہ شاید دنیا کے دوسرے بڑے لیڈر پنڈت جی پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے پاکستان کے بارے میں انہیں راہ راست پر لانے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس زمانے میں امریکہ میں صدر کینڈی کی ایک نئی اور

For more books visit www.4Urdu.com

جوان قیادت ابھری تھی۔ اقتدار سنبھالتے ہی صدر کینڈی نے پنڈت نہرو کے ساتھ قومی اور ذاتی سطح پر پینگیں بڑھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا۔ اس مقصد
URDU4U.COM
کے لیے انہوں نے اپنی ایک خاص معتمدا اور معاشیات کے بین الاقوامی ماہر پروفیسر گالبریتھ کو بھارت میں امریکن سفیر کے طور پر متعین بھی کر دیا۔ جولائی ۱۹۶۱ء میں صدر کینڈی کی دعوت پر صدر ایوب امریکہ کے سرکاری دورے پر گئے۔ مسز جیکولین کینڈی خصوصاً صدر ایوب کی شخصیت سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئیں اور دونوں میاں بیوی نے ان کی پذیرائی کے لیے انتہائی پروقار اور شاندار تقریبات منعقد کیں۔ ایک روز لنچ سے پہلے ہلکی پھلکی گفتگو ہو رہی تھی۔ صدر ایوب نے اچانک کسی قدر جذباتی انداز میں صدر کینڈی اور مسز کینڈی کو مخاطب کر کے کہا۔ "آپ دونوں ایک مثالی جوڑا ہیں۔ آپ کے حسن صورت اور حسن سیرت کے جادو سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ کیا آپ یہ جادو چلا کر پنڈت نہرو کو مسئلہ کشمیر حل کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتے؟ اس سے ہماری بہت سی مشکلات رفع ہو جائیں گی۔"

مسز کینڈی تو یہ سن کر تھوڑا سا جھینپی اور تھوڑا سا مسکرائی' لیکن صدر کینڈی زور سے ہنسے اور بولے۔ "مسٹر پریذیڈنٹ' پنڈت جواہر لال نہرو دنیا کے ہر موضوع پر نہایت عالمانہ گفتگو کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں لیکن جونہی کشمیر کا ذکر آئے وہ فوراً سر جھکا کر اپنی نگاہیں شیروانی کے کاج میں ٹنگے پھول پر گاڑ کر چپ سادھ لیتے ہیں' اور یوگیوں کی طرح آسن جما کر کسی گہرے مراقبے میں ڈوب جاتے ہیں۔"

ایک تو وہ زمانہ تھا جب پنڈت نہرو کے نخوت بھرے ناز و نخرے سر آنکھوں پر اٹھانے کے لیے دنیا کے بہت سے چھوٹے اور بڑے ملک ہر وقت چشم براہ رہتے تھے لیکن چین اور بھارت کے درمیان سرحدی جنگ کے دوران پنڈت جی کی ناقابل تسخیر شخصیت کی قلعی ایک دم کھل گئی' اور چینی یلغار کے ایک تھپیڑے سے ان کی عظمت اور بہادری کے ملمع کا بھرم چشم زدن میں آناً فاناً اٹھ گیا۔

For more books visit www.4Urdu.com

"ہندی چینی بھائی بھائی" کا بلند بانگ نعرہ کافی عرصہ سے سرد پڑ چکا تھا۔ اور اکتوبر ۱۹۶۲ء کے اوائل ہی سے پنڈت نہرو یہ گیدڑ بھبھکیاں دے رہے تھے کہ ہندوستانی فوجیں چینیوں کو لداخ اور نیفا کے متنازعہ علاقوں سے بہت جلد نکال باہر پھینکیں گی۔ اسی ماہ کی غالباً ۲۰ تاریخ تھی کہ میں ہارلے سٹریٹ راولپنڈی میں اپنے گھر سویا پڑا تھا' رات کے ڈھائی بجے تھے کہ اچانک میری کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں ایک کار داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحوں بعد میرے ملازم نے اندر آ کر مجھے بتایا کہ ایک چینی آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ غالباً وہ چینی پاکستان میں اردو زبان سیکھنے آیا ہوا تھا اور پہلے بھی مجھ سے کئی تقریبوں میں مل چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بھارت نے چینی سرحدوں پر پے درپے حملے کر کے چین کو جوابی کارروائی پر مجبور کر دیا ہے اور چینی فوج چند مقامات پر بھارت میں داخل ہو کر آگے بڑھ رہی ہے۔ اور وہ اس وقت مجھے یہی اطلاع دینے آیا ہے۔

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ نے یہ بات ہماری وزارت خارجہ تک بھی پہنچا دی ہے؟"

چینی مسکرایا اور بولا۔ "ہمارا خیال ہے کہ شاید صدر ایوب کو اس خبر میں خاصی دلچسپی اور اہمیت محسوس ہو۔ ہمارے اندازے کے مطابق آپ یہ خبر ان تک فوری طور پر پہنچانے میں زیادہ کام آ سکتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے آپکو ایسے بے وقت جگا کر یہ تکلیف دی ہے۔ یہ میرا ذاتی فعل ہے۔ سفارت خانے کی جانب سے نہیں۔"

سفارت کاری کے فن میں چینیوں کا اپنا ہی ایک خاص اور نرالا انداز ہے۔ وہ اپنے دوستوں پر بھی اپنی رائے یا مشورہ یا نصیحت خواہ مخواہ یا برملا ٹھونسنے کے عادی نہیں ہیں۔ لیکن اشاروں کنایوں میں اپنا عندیہ نہایت خوش اسلوبی سے واشگاف طور پر ظاہر کر دینے میں انتہائی مہارت رکھتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ رات کے ڈھائی بجے مجھے جگا کر غالباً وہ اپنے مخصوص انداز میں یہ پیغام پہنچا رہے تھے کہ جنگ کے یہی ابتدائی گھنٹے انتہائی اہم ہیں' ہندوستانی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے ہیں اور چینیوں کے خوف سے سر پر پاؤں رکھ کر ہر محاذ سے بھاگ رہی ہے۔ اگر پاکستان اس موقع سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے'

For more books visit www.4Urdu.com

تو ہرگز وقت ضائع نہ کریں۔

میں نے فوراً لباس تبدیل کیا اور اپنی کار نکال کر تیز رفتاری سے ایوان صدر جا پہنچا۔ اس وقت کوئی تین بجے کا عمل تھا۔ کسی قدر تگ ودود کے بعد مجھے صدر ایوب کی خواب گاہ تک رسائی حاصل ہو گئی۔ میں نے انہیں چینی کے ساتھ اپنی گفتگو تفصیلاً سنائی' تو انہوں نے بے ساختہ کہا۔ "یہ کوئی غیر متوقع خبر ہرگز نہیں۔ لیکن اتنی رات گئے تمہیں صرف یہ خبر سنانے کے لیے آنے سے اس کا اصلی مقصد کیا تھا؟"

میں نے اپنا قیاس بیان کیا کہ شاید اس کا مقصد یہ ہو کہ ہم ان لمحات کو اپنے حق میں کسی فائدہ مندی کے لیے استعمال میں لے آئیں

"مثلاً؟" صدر ایوب نے پوچھا۔

"مثلاً" میں نے اناڑیوں کی طرح تجویز پیش کی۔ اسی لمحے اگر ہماری افواج کی نقل و حرکت بھی مقبوضہ کشمیر کی سرحدوں کے خاص خاص مقامات کی جانب شروع ہو جائے' تو....."

صدر ایوب نے تیز و تند لہجے میں میری بات کاٹ کر کہا۔ "تم سویلین لوگ فوجی نقل و حرکت کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہو۔ جاؤ اب تم بھی جا کر آرام کرو۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

آج تک میرا یہی خیال ہے کہ اس رات صدر ایوب نے اپنی زندگی اور صدارت کا ایک اہم ترین سنہری موقع ہاتھ سے گنوا دیا۔ اگر ان کی قائدانہ صلاحیتوں پر نیند کا غبار نہ چھایا ہوتا اور ان کے کردار میں شیوہ دیوانگی اور شیوہ مردانگی کا کچھ امتزاج بھی موجزان ہوتا' تو غالباً اس روز ہماری تاریخ کا دھارا ایک نیا رخ اختیار کر سکتا تھا۔

سیلاب کے ریلے کی مانند جس طرح چینی فوجیں ہندوستان میں آگے بڑھی تھیں' بھارتی فوج کی اچھی طرح گوشمالی کرنے کے بعد اسی طرح تیزی سے واپس بھی لوٹ گئیں' پنڈت جواہر لال نہرو کی بے بسی' بیکسی اور شکست خوردگی کو اپنے مفاد کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے صدر کینڈی نے صدر ایوب پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ پنڈت جی

For more books visit www.4Urdu.com

کو فوراً ایک ذاتی پیغام بھیج کر انہیں یہ یقین دلائیں کہ چین کے ساتھ جنگ کے دوران ہندوستان کی سرحدوں پر پاکستان کی جانب سے ہرگز ہرگز کوئی گڑبڑ رونما نہ ہو گی۔

URDU4U.COM

صدر ایوب نے پنڈت نہرو کو اس نوعیت کا پیغام تو کوئی نہ بھیجا' لیکن پاکستان میں اپنے طرز عمل سے ہندوستان کو ہماری طرف سے ہر قسم کے خطرات اور شکوک و شبہات سے بے نیاز کر دیا۔

ہندو بنیوں میں ایک کہاوت ہے کہ چمڑی جاتی ہے تو جائے لیکن دمڑی ہاتھ میں آئے۔ چین کے ہاتھوں ہندوستان نے شکست تو نہایت شرمناک کھائی' لیکن اس داغ کو غیر ملکی امداد کی ریل پیل سے دھونے کے لیے پنڈت نہرو ساری دنیا کے سامنے نہایت بے حجابی سے چینی جارحیت کا ایک مظلوم اور معصوم پیکر بن کر کھڑے ہو گئے۔ چنانچہ اس بت کو رام کرنے کے لیے امریکہ اور انگلستان نے مل کر ہر قسم کی فوجی امداد اور جدید ترین اسلحہ جات نہایت بھاری پیمانے پر ہندوستان کو دینے کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے' پاکستان نے دبے لفظوں میں تھوڑا بہت احتجاج تو ضرور کیا' لیکن کسی نے ہماری باتوں کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ہر کوئی ہمیں بس اتنا کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ یہ فوجی امداد ہندوستان کو صرف چین کے خلاف استعمال کرنے کے لیے دی جا رہی ہے پاکستان کو اس سے کسی قسم کا کوئی خطرہ ہرگز لاحق نہ ہو گا۔

امریکہ کے اس رویے پر پاکستانی اخبارات میں بڑا شدید رد عمل شروع ہو گیا خود امریکہ میں بھی چند اخبارات نے یہاں تک لکھ دیا کہ ہندوستان کو بڑے پیمانے پر فوجی امداد دیتے وقت اسے قضیہ کشمیر کو حل کرنے پر پابند کرنے کا یہی ایک مناسب موقع ہے۔

غالباً یہ اسی قسم کے دباؤ کا نتیجہ تھا کہ اچانک ایک اعلیٰ سطحی بین الاقوامی وفد راولپنڈی میں آوارد ہوا۔ اس وفد میں برطانیہ کے کامن ویلتھ سیکرٹری مسٹر ڈنکن سینڈز (Sandys Mr Duncan) اور امریکہ کے اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ مسٹر ایورل ہیریمن (Harriman Mr Averell) شامل تھے۔ ڈنکن سینڈز ایک زمانے میں ونسٹن چرچل کے داماد بھی رہ چکے تھے' اور مسٹر ایورل ہیریمن دوسری جنگ عظیم کے دوران روز ویلٹ کے خصوصی

For more books visit www.4Urdu.com

ایلچی کے طور پر عالمی شہرت حاصل کر چکے تھے۔

۲۹ نومبر ۱۹۶۲ء کی ایک چمکیلی صبح تھی۔ ایوان صدر راولپنڈی کے لان میں نہایت خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ یہ دونوں حضرات صدر ایوب کے ساتھ باہر دھوپ میں بیٹھ گئے۔ اور کوئی گھنٹہ بھر کی محنت کے بعد انہوں نے ایک نہایت بے اثر' بے ثمر اور بوگس قسم کے اعلان کا ڈرافٹ تیار کیا جس کا متن یہ تھا:

Resolution

The President of Pakistan and the Prime Minister of India، have agreed that a renewed effort should be made to resolve the outstanding differences between their two countries on Kashmir and other related matters، so as to enable India and pakistan to live side by side in peace and friendship.

In consequence، they have decided to start discussion at an early date with the object of reading an honourable and equitable settlement. These wil be conduct initially at the ministerial level. ـt the aapropriate stage direct talk will be held between Mr Nehru and President Ayub.

صدر ایوب نے تو بلا چوں و چراں اس معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اور مسٹر ڈنکن سنیڈز اس دستاویز کو سینے سے لگا کر پنڈت نہرو کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لنچ کے فوراً بعد دہلی روانہ ہو گئے۔ پروگرام یہ تھا کہ جونہی پنڈت نہرو اس دستاویز پر اپنے دستخط ثبت فرمائیں' مسٹر سینڈز فوراً ٹیلیفون پر یہ خوشخبری راولپنڈی پہنچائیں گے یہ تو معلوم نہیں کہ دہلی پہنچ کر مسٹر ڈنکن سنیڈ پر نہرو جی کے ہاتھوں کیا گزری۔ لیکن یہاں راولپنڈی میں شام کے پانچ بجے ہی سے مسٹر ایورل ہیریمن ایوان صدر کے ڈرائینگ روم میں ہمہ تن انتظار ہو کر بیٹھ گئے۔ بے تابی کے عالم میں وہ کمرے میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ٹہلتے تھے' بار بار اپنی گھڑی دیکھتے تھے۔ اور پھر بت بن کر عالم سکتہ میں کرسی پر بیٹھ جاتے تھے۔ پورے سوا دو گھنٹے وہ اسی طرح آتش زیر پا حالت اضطراب میں مبتلا رہے' خدا خدا کر کے سوا سات بجے نئی دہلی سے ٹیلیفون آیا کہ پنڈت

For more books visit www.4Urdu.com

جواہر لال نہرو نے ٹھیک سات بجکر دس منٹ پر معاہدے پر دستخط کر دیئے ہیں۔ یہ سنتے ہی مسٹر ایورل ہیریمن مسرت و شادمانی سے ایسے سرشار ہو گئے جیسے انہوں نے ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی سر کر لی ہو۔ انہوں نے گرمجوشی سے اٹھ کر صدر ایوب کے ساتھ ہاتھ ملایا انہیں مبارک باد دی (کس بات کی؟ یہ مجھے آج تک نہیں معلوم ہو سکا) اور کامیابی اور کامرانی (کس کی؟) کے لمحات منانے کے لیے شیمپین کی بوتل کھونے کی فرمائش کی۔ شیمپین کا دور چل رہا تھا کہ مسٹر ایورل ہیریمن نے کسی قدر بلند آواز میں صدر ایوب کو مخاطب کر کے کہا۔ "مسٹر پریذیڈنٹ۔ آج کا دن ایک تاریخ ساز دن ہے۔ اس سے پورا فائدہ حاصل کرنے کے لیے آپ کی وزارت خارجہ کو اب ایسے خطوط پر چلنا پڑے گا' کہ امریکہ اور ہندوستان دونوں کے ساتھ یکساں صاف گوئی سے بات چیت کی جا سکے۔"

صدر ایوب حیرت سے کسی قدر چونکے اور بولے۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی بات کا مفہوم صاف صاف نہیں سمجھ سکا۔"

مسٹر ہیریمن نے کہا۔ "میرا مطلب ہے' آپ کو اپنا فارن سیکرٹری تبدیل کر لینا چاہیے۔ کم از کم ہمارا سفارت خانہ ان کے ساتھ آزادانہ گفتگو کرنے میں شدید ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔"

ان دنوں مسٹر ایس کے دہلوی ہماری وزارت خارجہ کے سیکرٹری تھے۔ مسٹر ایورل ہیریمن کے احکام کی پیروی میں صدر ایوب نے انہیں بہت جلد سفیر متعین کر کے قاہرہ بھیج دیا۔

۲۹ نومبر ۱۹۶۲ء کے معاہدہ پر پنڈت نہرو کے دستخطوں کی مہم سر کرتے ہی مسٹر ڈنکن سنینڈز فتح و نصرت کے جھنڈے لہراتے دہلی سے بسوئے لندن روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ کراچی تک ہی پہنچ پائے تھے کہ پنڈت جی نے ہندوستان کی لوک سبھا میں صدر ایوب کے ساتھ اپنے معاہدہ کی وضاحت میں منافقت سے بھرا ہوا ایک عجیب و غریب بیان دے ڈالا جس کا لب لباب یہ تھا کہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر یہ محض ایک رسمی سی

For more books visit www.4Urdu.com

کارروائی تھی' اور اس معاہدہ کی وجہ سے کشمیر کے متعلق ہندوستان کے رویے میں ہرگز کسی قسم کی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ یہ سنتے ہی مسٹر ڈنکن سنیڈز نے لندن کا سفر منسوخ کیا' اور کراچی سے صدر ایوب کو بتایا کہ وہ ابھی نئی دہلی واپس جا رہے ہیں' اور پنڈت نہرو کو اس بے معنی اور مفسدانہ بیان کی تردید کرنے پر مجبور کریں گے۔ اسی شام ایک بار پھر ایوان صدر راولپنڈی کا ڈرائنگ روم زحمت انتظار کی لپیٹ میں بری طرح آ گیا۔ کل کی طرح آج بھی مسٹر ایورل ہیریمن مٹی کا مادھو بنے ایک کرسی پر آ کر گم سم بیٹھ گئے۔ بے چینی سے اٹھ اٹھ کر کمرے میں بدحواسی سے ٹہلتے تھے' بار بار گھڑی دیکھتے تھے' اور پھر یوگیوں کی طرح آسن جما کر بے حس و حرکت بیٹھ جاتے تھے' گزشتہ شام ہم سب نے اس ماحول میں سوا دو گھنٹے گزارے تھے' لیکن آج انتظار کی یہ کٹھن گھڑیاں بے حد طویل ہو گئیں۔ رات کے گیارہ بجکر بیس منٹ پر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ پہلے صدر ایوب نے مسٹر ڈنکن سنیڈز کے ساتھ چند منٹ گفتگو کی۔ پھر مسٹر ایورل ہیریمن نے بے تابی سے لپک کر ریسور تھاما' اور کافی طویل عرصہ تک ان کے ساتھ بات چیت کرتے رہے' ٹیلیفون کی اس ساحرانہ گھنٹی نے کمرے پر چھائی ہوئی مردنی کو مکڑی کے جالے کیطرح اتار پھینکا۔ اور ڈرائینگ روم میں ازسر نو چہل پہل کی رونق واپس آ گئی۔

مسٹر ڈنکن سنیڈز کے ٹیلیفون سے یہ عقدہ کھلا کہ انہوں نے رات گئے پنڈت نہرو کو ایسے وقت جا پکڑا جب وہ شب خوابی کا لباس پہن کر سونے کے لیے اپنے پلنگ پر لیٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔ پہلے تو وہ صاف مکر گئے کہ انہوں نے کوئی ایسی بات کہی ہے جس سے کسی قسم کی غلط فہمی یا بدگمانی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ پھر ڈنکن سنیڈز کے پرو زور اصرار پر انہوں نے آئیں بائیں شائیں کر کے حیلے بہانوں سے لوک سبھا میں اپنے بیان کو توڑ مروڑ کر کچھ عذر لنگ پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مسٹر سنیڈز نے جب ان کی نرم و نازک کلائی کو کسی قدر مزید مروڑا تو پنڈت جی نے حسب

For more books visit www.4Urdu.com

عادت فوراً یہ وعدہ کر لیا کہ وہ بہت جلد ایک ایسا بیان جاری کر دیں گے جس سے ہر قسم کی غلط فہمی اور بدگمانی کا پورا پورا ازالہ ہو جائے۔

URDU4U.COM

لیکن پنڈت جی کے دوسرے بہت سے وعدوں کی طرح ان کا یہ وعدہ بھی ایک بھونڈا سا مذاق ہی ثابت ہوا۔ دو روز کے بعد انہوں نے بغیر کسی سیاق و سباق کے ایک ایسا گول مول سا بیان فرمایا جس سے تنازعہ کشمیر کے حل کی جانب تو بالکل کوئی راستہ وا نہ ہوا' البتہ برطانیہ اور امریکہ کی جانب سے ہندوستان کی جھولی میں مالی اور فوجی امدا بدستور بڑھتی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنا الو سیدھا کرنے اور دوسروں کو کامیابی سے الو بنانے میں پنڈت جواہر لال نہرو کو خاص مہارت حاصل تھی۔

لیکن یہ بھی درست ہے کہ پنڈت جی کی تمام تر چالبازیوں' ہیرا پھیریوں اور منافقتوں کے باوجود ان کا نفسیاتی ہوا صدر ایوب کے دل و دماغ پر کسی نہ کسی حد تک ہمیشہ چھایا رہا' میرے تجربے میں ایسا کوئی موقع دیکھنے میں نہیں آیا جب وہ پنڈت جی کے سامنے اکثر اوقات دبے دبے سے مرعوب ہوتے ہوئے نظر نہ آ رہے ہوں۔ لیکن پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات کے بعد یہ صورت حال یک لخت تبدیل ہو گئی۔ جب شری لال بہادر شاستری بھارت کی وزارت عظمٰی پر براجمان ہوئے تو صدر ایوب اچانک خود اپنی ہی نظر میں قد آور ہو گئے۔ پنڈت نہرو کی موجودگی میں وہ بلاوجہ احساس کمتری میں مبتلا رہا کرتے تھے' لیکن لال بہادر شاستری کے آتے ہی وہ اسی طرح بلاوجہ احساس برتری کا شکار ہو گئے۔ یہ نفسیاتی زیروبم ان کے کردار کا ایک ایسا المیہ تھا' جس نے رفتہ رفتہ انہیں غلط راستوں اور غلط فیصلوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر انجام کار زوال کے قعر مذلت میں جا پھینکا۔

اکتوبر ۱۹۶۴ء میں وزیراعظم لال بہادر شاستری قاہرہ میں غیر جانبدار ممالک کی ایک کانفرنس میں شرکت کے بعد واپسی پر مختصر سے قیام کے لیے کراچی ائیرپورٹ پر رکے' تو صدر ایوب نے انہیں ہوائی اڈے پر ہی لنچ کھلایا۔ شاستری جی چھوٹے قد کے دبلے پتلے اور نحیف سے آدمی تھے' ملاقات خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ لیکن نفسیاتی طور پر صدر ایوب

For more books visit www.4Urdu.com

بیٹھے بٹھائے بلاوجہ شیر ہو گئے۔ اب وہ جگہ جگہ موقع بے موقع جہاں کہیں لال بہادر شاستری کا ذکر آتا' ان کو تمسخر و تضحیک کا نشانہ بناتے' اور اکثر اوقات کہا کرتے تھے' کہ "اس بالشت ڈیڑھ بالشت کے آدمی کے ساتھ کوئی سنجیدہ گفتگو کرنا بیکار وقت ضائع کرنا ہے۔"

مسٹر ذوالفقا علی بھٹو نے مجھے تاشقند کا ایک واقعہ سنایا تھا۔ بھارت اور پاکستان کے باہمی مذاکرات ایک مقام پر آ کر شدید تعطل کا شکار ہو گئے تھے۔ روس کے وزیراعظم کوسیجن نے کئی بار آ کر صدر ایوب پر زور دیا کہ وہ مذاکرات کو ناکام نہ ہونے دیں اور مسٹر شاستری کے ساتھ اپنی گفتگو جاری رکھیں۔ ایک بار صدر ایوب مذاق مذاق میں مسٹر کوسیجن سے یہ کہہ بیٹھے۔ "مجھے ہرگز یہ توقع نہیں کہ اس بالشت ڈیڑھ بالشت کے منحنی سے شخص کے ساتھ کوئی فیصلہ کن گفتگو ہو سکے۔" مسٹر بھٹو کا کہنا تھا کہ یہ سنتے ہی مسٹر کوسیجن سیخ پا ہو گئے اور انہوں نے نہایت سختی سے صدر ایوب سے کہا۔ "مسٹر شاستری ایک عظیم قوم کے مسلمہ اور عظیم لیڈر ہیں' ہم ان کی دل سے عزت کرتے ہیں۔ آپ کو یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ میرے سامنے ان کی شان میں اس قسم کے گھٹیا الفاظ استعمال کریں۔"

مسٹر بھٹو کا کہنا تھا کہ وزیراعظم کوسیجن کی اس ایک ڈانٹ نے صدر ایوب کے دل و دماغ سے خود اعتمادی کا غبارہ بھک سے اڑا کر نکال باہر پھینکا' اور اس کے بعد وہ معاہدہ تاشقند میں شاستری جی کی ہر ضد کے سامنے بلا پس و پیش ہتھیار ڈالتے چلے گئے۔

تاشقند میں تو خیر جو ہوا سو ہوا لیکن اس میں شک نہیں کہ شروع ہی سے صدر ایوب کی نگاہ میں شری لال بہادر شاستری کی کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ جنوری ۱۹۶۵ء میں انہوں نے تقریباً تمام سیاسی پارٹیوں کی اجتماعی مخالفت کے باوجود مس فاطمہ جناح کے مقابلے میں صدارتی انتخاب جیت لیا تھا۔ اس مقابلے میں فیلڈ مارشل کو مس جناح سے تقریباً اکیس ہزار ووٹ زیادہ ملے۔ چنانچہ اب وہ اپنے آپ کو واقعی قوم

For more books visit www.4Urdu.com

کا مسلمہ اور منتخب صدر سمجھنے لگے اور اپنے ہر قول و فعل کو ملک و قوم کی متفقہ آواز کی صدائے بازگشت قرار دینے لگے۔ اس پس منظر میں جس تناسب سے ان کے اندر خود اعتمادی کا احساس فروغ پاتا گیا' اسی رفتار سے ان کے اردگرد ایسے خود غرض خوشامدیوں اور جی حضوریوں کا حلقہ بھی وسیع تر ہوتا چلا گیا جو چرب زبانی سے ان کی ہاں میں ہاں ملا کر انہیں صحیح یا غلط راہوں پر ڈالنا اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھتے تھے۔

صدارتی انتخاب جیتنے کے چند ماہ بعد رن آف کچھ کا سانحہ پیش آ گیا۔ یہ تنازعہ آٹھ دس برس سے چلا آ رہا تھا' لیکن بھارت نے اچانک یہ الزام تراشی شروع کر دی کہ کچھ آڑ بنا کر پاکستان گجرات میں زیر زمین تیل کے کچھ علاقوں کو ہضم کرنا چاہتا ہے۔ بھارتی اور پاکستانی فوجوں کے درمیان ایک ہنگامی جھڑپ میں ہمارا پلہ کافی بھاری رہا اور ہندوستانی فوج کا کچھ ساز و سامان بھی ہمارے قبضہ میں آ گیا۔ برطانیہ نے ثالثی اختیار کر کے ۳۵۰ مربع میل کا علاقہ پاکستان کے حوالے کر دینے کا فیصلہ دے دیا۔ اس پر بھارت میں بڑا شور و غوغا ہوا' اور وزیراعظم لال بہادر شاستری پر کڑی نکتہ چینی شروع ہو گئی۔ ان واقعات نے صدر ایوب کے دل میں بھارتی فوج پر پاکستانی فوج کی برتری کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز تصورات کو جنم دیا اور لال بہادر شاستری کی قائدانہ صلاحیت ان کی نظر میں اور بھی زیادہ گر گئی۔ شاستری جی نے ایک موقع پر یہ اعلان فرمایا کہ رن آف کچھ کے واقعہ کو وہ ہرگز نہیں بھلا سکتے۔ بلکہ اپنی مرضی کے وقت اور مقام پر وہ اس کا حساب ضرور بے باق کر کے رہیں گے۔

اس کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کی رفتار روز افزوں بڑھتی ہی چلی گئی۔ ۱۹۶۵ء کے وسط ہی میں لال بہادر شاستری اور ان کے وزیر خارجہ نے ڈنکے کی چوٹ یہ صاف صاف اعلان کر دیا کہ جموں و کشمیر کی ریاست بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور پاکستان کا اس کے کسی حصہ پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں۔

اس صورت حال میں صدر ایوب کو کیا راستہ اختیار کرنا چاہیے تھا؟ وہ یہ معاملہ ازسر نو یو۔ این۔ او کی سیکورٹی کونسل میں لے جا سکتے تھے۔ لیکن یہ امر یقینی تھا کہ اگر سیکیورٹی

For more books visit www.4Urdu.com

کونسل کوئی ایسا فیصلہ کرنا چاہتی جو بھارت کو ناقابل قبول ہوتا تو روس ضرور اس کے خلاف اپنا ویٹو استعمال کرتا۔ ۲۳ جون ۱۹۶۲ء تک روس پہلے ہی اس مسئلہ پر ہندوستان کے حق میں اور پاکستان کے خلاف ۱۰۰ مرتبہ اپنا ویٹو استعمال کر چکا تھا۔

URDU4U.COM

ہندوستان کے ساتھ براہ راست یا کسی تیسرے ملک کی نگرانی میں گفت و شنید کے ذریعہ مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کرنا بھی ایک دور از کار بات ہوتی۔ کیونکہ ماضی میں اس سلسلے میں ہماری تمام کوششیں ناکام اور تلخ ثابت ہو چکی تھیں۔

جہاں تک اس مسئلہ پر جنگ کرنے کا تعلق ہے' پہلے تو صدر ایوب جنگ کا نام لیتے ہی کانوں کو ہاتھ لگایا کرتے تھے۔ اور ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ تنازعہ کشمیر کا حل ہم نے پاکستان کے مفاد کی خاطر ڈھونڈھنا ہے۔ اس حل کی تلاش میں پاکستان کو داؤ پر نہیں لگانا' پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے یکایک ایسے اقدامات شروع کر دیئے' جن کا قدرتی اور منطقی نتیجہ وہ جنگ تھی جو ستمبر ۱۹۵۶ء میں بھارت اور پاکستان کے درمیان لڑی گئی۔

یہ جنگ اب تک میرے لیے ایک معمہ ہے۔ ان دنوں میں ہالینڈ میں بطور سفیر متعین تھا۔ اس لیے اس جنگ کے اندرونی اسباب اور سیاق و سباق کا مجھے ذاتی طور پر کوئی علم نہیں ہے۔ اگر صدر ایوب چاہتے تو وہ نہایت آسانی سے اپنی کتاب "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" Friends not Masters میں خود اس موضوع پر خاطر خواہ روشنی ڈال سکتے تھے۔ یہ کتاب ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی تھی' اور دیباچہ میں ان کے اپنے بیان کے مطابق اس کا مسودہ ۱۹۶۵ء کے دوران بھی ان کے زیر غور تھا۔ یہ جنگ ان کے عہد صدارت کا ایک نہایت اہم تاریخی واقعہ تھا۔ اس لیے یہ امر میرے لیے باعث حیرت ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر تک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اگرچہ اس جنگ میں پوری پاکستانی قوم نے صدر ایوب کا بھرپور ساتھ دیا تھا' تاہم ممکن ہے کہ پیچھے کی طرف مڑ کر وہ اس جنگ کو اپنی فوجی مہارت' تدبر' سیاسی بصیرت' دوراندیشی اور دانشمندی کا کوئی خاص امتیازی نشان نہ سمجھتے ہوں۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ

For more books visit www.4Urdu.com

جنگ بندی کے بعد معاہدہ تاشقند کے خلاف مسٹر بھٹو کی شدید مہم کا کھلم کھلا دو ٹوک مقابلہ کرنے سے وہ اپنے آپ کو کسی قدر قاصر پاتے ہوں۔ صدارت کی کرسی انسان کو بااختیار تو ضرور بنا دیتی ہے۔ لیکن بعض معاملات میں حالات کی نزاکت ان سے زبان بندی کا تقاضا بھی ضرور کرتی ہے۔

URDU4U.COM

فوجی یا کسی دوسرے ادارے کی جانب سے ابھی تک اس جنگ کی کوئی مستند تاریخ تجزیہ اور جائزہ ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ ریٹائرڈ ائیر مارشل اصغر خاں کی کتاب (Round The First) اس موضوع پر ایک دلچسپ تصنیف ہے۔ اصغر خاں صاحب ایک سچے دیانتدار اور پرخلوص انسان ہیں۔ اس لیے جو واقعات انہوں نے قلم بند کیے ہیں' انہیں صحیح اور معتبر تسلیم کرنے میں مجھے بالکل کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ البتہ کہیں کہیں ان کی رائے کا توازن اعتدال کی حد سے باہر نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

مثلاً ایک مقام پر انہوں نے لکھا ہے کہ یکم یا دوئم ستمبر ۱۹۶۵ء کو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو چین کے وزیر خارجہ مارشل چن یی سے کراچی کے ہوائی اڈہ پر تھوڑی دیر کے لیے ملے تھے۔ مارشل چن یی اس وقت پیرس جا رہے تھے۔ اس ملاقات کے بعد مسٹر بھٹو اور وزارت خارجہ کے سیکرٹری مسٹر عزیز احمد نے مارشل چن یی کے حوالے سے صدر ایوب کو یقین دلا دیا تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں ہم اپنے گوریلا لڑاکوں' اور مجاہدین اور دیگر فوجی دستوں کو بھیج بھیج کر جو کاروائیاں جی چاہے کرتے رہیں' بھارت کسی صورت میں بھی یہ جرات نہ کرے گا کہ وہ بین الاقوامی سرحد توڑ کر پاکستان پر حملہ آور ہو۔ اس واقعہ کو مثال بنا کر اصغر خاں صاحب نے اپنی ذاتی رائے سے خود ہی یہ نتیجہ نکال لیا کہ بھٹو صاحب کو اپنی جگہ پر یقین تھا کہ ایسے حالات میں ہندوستان لازمی طور پر پاکستان پر براہ راست حملہ کرے گا۔ لیکن وہ جان بوجھ کر صدر ایوب کو گمراہی کے راستہ پر ڈال رہے تھے۔ تاکہ ہندوستان کے ہاتھوں پاکستان کو شکست فاش نصیب ہو اور اس کے بعد بھٹو صاحب بذات خود پاکستان کی مسند صدارت پر قبضہ جما کر بیٹھ جائیں۔ ماروں

For more books visit www.4Urdu.com

گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ ریٹائرڈ ائیرمارشل کی یہ نرالی منطق میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔

غالباً بھٹو دشمنی کے اسی جذبہ بے نیام کے تحت اصغر خاں صاحب اپنی کتاب میں مزید فرماتے ہیں کہ برسر اقتدار آنے کے لیے ۱۹۶۵ء میں تو بھٹو صاحب کے عزائم شرمندہ تکمیل نہ ہو سکے۔ لیکن چھ برس بعد ان کی آرزو پوری ہو گئی جب ۱۹۷۱ء میں پاکستان کو زبردست فوجی شکست ہوئی' جنرل یحییٰ خاں معزول ہوئے' ملک دو نیم ہوا اور انجام کار مسٹر بھٹو صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے عہدے سنبھال کر برسر اقتدار آ گئے۔ بین السطور غالباً ریٹائرڈ ائیرمارشل صاحب یہی تاثر دینا چاہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کہ ذمہ داری تمام تر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی ذات پر تھی اور وہ اس تخریبی کارروائی میں ۱۹۶۵ء ہی سے مصروف عمل تھے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کی بابت ایک دوسری کتاب جو میری نظر سے گزری ہے' وہ جنرل موسیٰ کی تصنیف "My Version" ہے۔ اس کتاب کو پڑھنا نہایت کٹھن اور صبر آزما کوشش ہے۔ اس جنگ کے متعلق عوام الناس کے ذہن میں جو سوالات ہیں' یہ کتاب ان میں سے کسی کا بھی کوئی جواب فراہم نہیں کرتی اور کسی نکتے پر کوئی خاص یا مزید روشنی نہیں ڈالتی۔ پاکستان کی بری فوج کے ایک سابق کمانڈر انچیف کے قلم سے اس سے کہیں بہتر تحریر کی توقع رکھنی چاہیے تھی' خاص طور پر جو اس جنگ کے دوران بری فوج کا سربراہ بھی رہ چکا ہو۔

اس جنگ کے متعلق ان دو کتابوں کے علاوہ عوام اور خواص کے مختلف طبقوں میں طرح طرح کی قیاس آرائیوں کا کوئی شمار نہیں۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ جنگ قادیانیوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔ اس لیے فوج کے ایک نہایت قابل قادیانی افسر میجر جنرل اختر حسین ملک نے مقبوضہ کشمیر پر تسلط قائم کرنے کے لیے ایک پلان تیار کیا جس کا کوڈ نام "جبرالٹر" تھا۔ صاحبان اقتدار کے کئی افراد نے ان کی مدد کی۔ ان میں مسٹر ایم ایم احمد سرفہرست بتائے جاتے ہیں جو خود

For more books visit www.4Urdu.com

بھی قادیانی تھے اور عہدے میں بھی پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئر مین ہونے کی حیثیت سے صدر ایوب کے نہایت قریب تھے۔ جنرل اختر ملک نے اپنے پلان کے مطابق کارروائی شروع کی اور اکھنور کو فتح کرنے کے قریب ہی تھے کہ فوج میں جنرل موسیٰ سمیت کئی اور جرنیل بھی تشویش میں پڑ گئے کہ اگر اختر ملک کی مہم کامیاب ہو گئی تو وہ ایک فوجی ہیرو کی حیثیت سے ابھریں گے۔ صدر ایوب سمیت غالباً باقی بہت سے فوجی اور غیر فوجی صاحبان اقتدار یہ نہیں چاہتے تھے کہ میجر جنرل اختر ملک اس جنگ کے ہیرو بن کر ابھریں اور فوج کے اگلے کمانڈر انچیف کے عہدے کے حقدار بن سکیں۔ کیونکہ یہ عہدہ صدر ایوب نے ذہنی طور پر پہلے ہی سے جنرل یحییٰ خاں کے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔ چنانچہ عین اس وقت جب میجر جنرل اختر حسین ملک انتہائی کامیابی سے چھمب اکھنور سیکٹر پر تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں معاً ان کی کمانڈ سے ہٹا دیا گیا اور ان کی جگہ جنرل یحییٰ خاں کو یہ کمانڈ سونپ دی گئی۔ غالباً اس لیے کہ وہ پاکستانی فوج کو اکھنور فتح کرنے کی کوشش سے باز رکھ سکیں۔ یہ فریضہ انہوں نے نہایت کامیابی سے سر انجام دیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ بھارت کے عزائم سے ہمارے فوجی اور سول ادارے اتنے بے خبر تھے کہ انہیں ہندوستان کے حملے کا اس وقت علم ہوا جب رات کے اندھیرے میں بھارتی فوج ہماری سرحد کو پار کرنے کے بعد تیزی سے لاہور کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انٹیلی جنس بیورو کے ایک اعلیٰ افسر نے مجھے خود بتایا کہ ان کا ایک ایجنٹ اپنے معمول کے مطابق سرحد کی طرف کسی خفیہ مشن پر جا رہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ اگلی جانب سے تیز تیز روشنیاں بڑھتی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔ کسی قدر چھان بین کے بعد اسے معلوم ہوا کہ بھارتی فوج کے ٹینک سرحد پار کر کے لاہور پر چڑھائی کر رہے ہیں۔ وہ بھاگم بھاگ واپس آیا۔ اس نے اپنے کسی پولیس افسر کو یہ خبر دی' پولیس افسر نے کسی فوجی افسر کو ٹیلیفون کیا۔ فوجی افسر نے لاہور کے جی او سی کو جگا کر خبردار کیا'

For more books visit www.4Urdu.com

کہتے ہیں کہ جی۔ او۔ سی نے فوری طور پر اس خبر کو سچ ماننے سے کسی قدر ہچکچاہٹ سے کام لیا۔

ایک بار میں نے نواب آف کالا باغ سے اس جنگ کے متعلق کچھ دریافت کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے فرمایا "بھائی شہاب' یہ جنگ پاکستان کی جنگ ہرگز نہ تھی۔ دراصل یہ جنگ اختر ملک' ایم۔ ایم۔ احمد۔ بھٹو' عزیز احمد اور نذیر احمد نے شروع کروائی تھی۔"

جب میں نے پوچھا' کہ جنگ شروع کروانے سے ان حضرات کا کیا مقصد تھا' تو نواب صاحب نے جواب دیا۔ "یہ لوگ ایوب خاں کو شکنجے میں کس کر اپنی طاقت بڑھانا چاہتے تھے۔ اس عمل میں اگر پاکستان کا ستیاناس ہوتا ہے تو ان کی بلا سے۔"

میں بالکل نہیں کہہ سکتا کہ اصلی حقیقت کیا ہے۔ لیکن اس جنگ میں ہماری فوج کی ہائی کمانڈ نے برسر عام اپنی ہمت' مہارت اور اہلیت کا کوئی خاص مظاہرہ نہیں کیا۔ بھارتی حملے روکنے اور پسپا کرنے کا سہرا ہماری ایئرفورس اور فوجی نوجوان افسروں اور جوانوں کے سر ہے جنہوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر حیرت انگیز جوانمردی دکھائی اور بعض نے وطن عزیز کے دفاع میں جام شہادت نوش کیا۔

پاکستان پر ہندوستان کے حملے کی خبر میں نے ہالینڈ کے دارالخلافہ ہیگ میں سب سے پہلے بی بی سی لندن کے ایک براڈ کاسٹ میں سنی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستانی ہائی کمشن لندن کے ایک اعلان کے مطابق بھارتی افواج نے لاہور پر قبضہ کر لیا ہے۔ میں نے فوراً ہالینڈ کے ریڈیو اور ٹی وی کے اداروں کو ٹیلیفون کیا اور درخواست کی کہ وہ فوراً اس خبر کی تصدیق یا تردید کر کے مجھے مطلع فرمائیں۔ چند منٹ کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ بھارت کے وزیراعظم لال بہادر شاستری نے لوک سبھا میں یہ اعلان کیا ہے کہ لاہور ہندوستانی فوج کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ یہ سنتے ہی عفت بے اختیار رونے لگی۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھولا۔ باہر صوفی مشرف خاں اور ان کے مرید صوفی Witteveen

For more books visit www.4Urdu.com

کھڑے تھے۔ صوفی (Witteveen) ایک عالم و فاضل پروفیسر تھے جو ان دنوں ہالینڈ کی کابینہ میں وزیر خزانہ کے عہدہ پر فائز تھے۔ اندر آ کر وہ دونوں غمگینی کے عالم میں خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ عفت ان کی خاطر و مدارت کے لیے ایک ٹرالی میں چائے وغیرہ کے لوازمات سجا کر لے آئی صوفی مشرف خان بولے۔ "بیٹی' اس سے غم کھانے کے علاوہ اور کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔"

عفت پھر رونے لگی اور سسکیاں بھرتی ہوئی فرش پر بیٹھ گئی۔ صوفی مشرف خاں اسے دلاسہ دینے اس کے پاس ہی زمین پر آ بیٹھے۔ اپنے پیر و مرشد کی پیروی میں ولندیزی وزیر صاحب بھی کرسی چھوڑ کر نیچے آ بیٹھے۔ میں بھی انہیں کے حلقے میں شامل ہو گیا' کچھ دیر ہم یونہی خاموش اور غمگین زمین پر بیٹھے رہے۔ پھر اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میرا جی نہ چاہتا تھا کہ میں اٹھ کر ٹیلیفون سنوں۔ اگر لاہور ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے تو اب نہ جانے کس دوسرے شہر کی خبر ہمارے کانوں میں پڑے۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ ڈچ وزیر صاحب نے اٹھ کر ٹیلیفون سنا اور پھر عربی میں الحمد للہ الحمدللہ' سبحان اللہ' سبحان اللہ کہتے ہوئے میرے ساتھ لپٹ گئے اور بولے کہ ڈچ ریڈیو نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ لاہور کے متعلق بی بی سی کی خبر اور لال بہادر شاستری کا اعلان بالکل غلط اور جھوٹ ہیں۔ ہندوستان نے بغیر اعلان جنگ کے پاکستان پر حملہ ضرور کیا ہے لیکن پاکستانی افواج نہایت بہادری سے ہر محاذ پر ان کا بھر پور مقابلہ کر رہی ہیں۔

کئی گھنٹوں کی تگ و دو کے بعد بڑی مشکل سے ٹیلیفون کے ذریعہ میرا رابطہ پہلے اپنے وزیر خارجہ مسٹر بھٹو اور پھر صدر ایوب کے ساتھ قائم ہوا۔ دونوں کی آواز میں ہمت اور خود اعتمادی کا وزن تھا۔ ان کی ہدایات کے مطابق اگلے روز میں نے ہالینڈ کے وزیراعظم اور وزیر خارجہ سے ملاقات کی۔ ان دونوں نے نہایت خوشدلی سے وعدہ کیا کہ یو' این' او اور سیکیورٹی کونسل میں جہاں کہیں بھی ضرورت پڑی' وہ پاکستان کی بھر پور حمایت

For more books visit www.4Urdu.com

کریں گے۔ وزیر خارجہ نے تو میری موجودگی ہی میں نیویارک ٹیلیفون کیا اور یو۔ این۔ او میں ہالینڈ کے نمائندے کو اس بارے میں نہایت واضح ہدایات دے دیں۔

URDU4U.COM

اسی شام ہالینڈ کی ایک بہت بڑی صنعت کے چند انجینئر ہمارے سفارتخانے میں آئے اور ہمارے ڈارننگ روم میں چند ایسے حساس آلات نصب کر گئے جن کا ایک بٹن دبا کر ہم ریڈیو پاکستان کی نشریات کسی وقت بھی نہایت آسانی سے سن سکتے تھے۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ یہ بندوبست ہماری سہولت کے لیے میرے ولندیزی دوست اور وزیر کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔

اس کٹھن آزمائش کے عین دوران ہمارے دیرینہ آقا اور مربی امریکہ نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان کو ہر قسم کا جنگی سامان فراہم کرنا بند کر دیا جائے۔ اس وقت بھی ہالینڈ کے وزیر خزانہ مسٹر (Witteveen) نے چند فوری ضروریات پورا کرنے میں ہماری کافی مدد فرمائی۔ یہ سامان میری طرف سے Diplomatic Bags کی حیثیت سے کے۔ ایل۔ ایم کے عام پروازوں سے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے نام کراچی پہنچایا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ فقط کاغذات کے تھیلے نہ ہوتے تھے۔

اس جنگ کے دوران ایران اور ترکی نے بھی حسب توفیق ہماری مدد کی' لیکن انڈونیشیا کے صدر ڈاکٹر احمد سوئیکارنو نے کئی لڑاکا ہوائی جہاز' چند میزائل بردار سمندر جہاز اور دو جنگی آبدوزیں فراہم کر کے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ اس کے علاوہ چین نے بھارت کے ساتھ شمالی سرحدوں پر اپنی فوجوں کے اجتماع کا مظاہرہ کر کے اور ہندوستان کو ایک سخت الٹی میٹم دے کر اس جنگ کا نہ صرف رنگ بدلنے کی دھمکی دی بلکہ ہمارے ساتھ اپنی گہری دوستی کا عملی ثبوت بھی دیا۔

اس کے برعکس امریکہ اور برطانیہ کا رویہ ہمارے ساتھ بالکل مختلف تھا۔ میں نے سنا ہے کہ جس شب ہندوستان نے لاہور کی جانب اپنا حملہ شروع کیا تھا' اسی صبح سب سے پہلے امریکن سفیر راولپنڈی کے ایوان صدر میں آ دھمکے۔ اس وقت غالباً صدر ایوب ناشتہ کر رہے تھے۔ سفیر صاحب اپنے ہاتھوں کا شکنجہ سا بنا کر صدر ایوب کی گردن کے قریب

For more books visit www.4Urdu.com

لے گئے اور کسی قدر سخت لہجے میں بولے۔ ”مسٹر پریذیڈنٹ‘ ہندوستان نے آپ کو گلے سے دبوچ رکھا ہے۔ ان کے ساتھ صلح کرنے میں جلدی کیجیے۔“ برطانوی ہائی کمشنر مورس جیمز بھی وقتہ فوقتہ کبھی کھلم کھلا‘ کبھی چوری چھپے صدر ایوب سے ملتے رہتے تھے‘ اور ہندوستان کے ساتھ کسی قیمت پر بھی جنگ بند کرنے کا مشورہ دیتے رہتے تھے۔

URDU4U.COM

ہالینڈ میں بیٹھ کر پہلے چند روز تو جنگ کا نقشہ ہمارے حق میں بڑا حوصلہ افزا نظر آتا رہا۔ لیکن پھر یکایک جمود کی کہر چھا گئی‘ اور اس کے بعد طرح طرح سے جنگ بندی کی باتیں سننے میں آنے لگیں۔ اسی زمانے میں افغانستان کا ایک دو رکنی وفد کسی تجارتی مشن پر ہیگ آیا ہوا تھا۔ ایک لنچ کی دعوت میں میری ان سے ملاقات ہوئی‘ تو میں نے وفد کے سربراہ سے پوچھا کہ پاکستان ہندوستان کے ساتھ جنگ کی مصیبت میں مبتلا ہے۔ ایسے نازک زمانہ میں افغانستان میں عام لام بندی اور فوجی ملازمین کو فوری طور پر رخصت سے واپس بلا لینے کے اعلان کی وجہ سے ہماری تشویش میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ افغانی وزیر صاحب صرف فارسی اور فرانسیسی زبان بولتے تھے۔ ان کے مترجم نے کہا کہ وفد کے رئیس آپ کی بات کا شافی جواب دینا چاہتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہوٹل میں اپنے کمرے میں انتظار کریں گے۔ آپ وہاں تشریف لے آئیں اور ہمارے ساتھ کافی نوش فرمائیں۔

لنچ کے فوراً بعد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ نہایت مروت اور شفقت سے پیش آئے۔ ان کے ساتھ میں کوئی پون گھنٹہ رہا۔ اس عرصہ میں انہوں نے اپنی گفتگو میں جو کچھ فرمایا‘ اس کا خلاصہ کچھ اس طرح کا تھا کہ ریاستوں کے درمیان سیاسی تعلقات ہوتے ہیں‘ مسلمانوں کے درمیان اسلامی تعلقات ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر ہماری ریاست چاہے بھی تو ہمارے مسلمان عوام ہمیں ہرگز یہ اجازت نہ دیں گے کہ ہم ایسے نازک موقع پر اپنے اسلامی برادر ملک پاکستان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیں۔ اس وقت افغانستان میں جو اقدامات آپ کے لیے باعث تشویش نظر آ رہے ہیں‘ وہ ہمارے اندرونی

For more books visit www.4Urdu.com

اور کچھ بیرونی سیاسی تقاضے ہیں۔ ان کی وجہ سے آپ کے دل میں پاکستان کے لیے کوئی مزید خطرہ ہرگز نہ ابھرنا چاہیے۔ عام طور پر افغانیوں کی سیاسی اور سفارتی گفتگو کسی قدر ذو معنی یا مبہم یا پیچدار ہوا کرتی ہے۔ لیکن اس گفتگو میں مجھے کسی قدر خلوص کے رنگ کی جھلک محسوس ہوئی۔ گھر آتے ہی میں نے راولپنڈی میں صدر ایوب کے ساتھ ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا۔ اس وقت پاکستانی ٹائم کے مطابق رات کے تقریباً دس یا پونے دس بجے ہوں گے' لیکن صدر ایوب کی آواز میں غیر معمولی تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے انہیں افغانی وزیر کے ساتھ اپنی گفتگو کا لب لباب سنایا' تو وہ چڑ سے گئے اور تیز لہجے میں صرف اتنا کہہ کر ٹیلیفون بند کر دیا: "یہ ایک چال بھی ہو سکتی ہے' ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر میں پاکستان کو تباہی کے غار میں ہرگز نہیں دھکیل سکتا۔"

صدر ایوب کی اس جھنجھلاہٹ' اور اس غصیلے رویے سے یہی اندازہ لگتا تھا کہ وہ کسی شدید الجھن میں مبتلا ہیں' اور جنگ کے غیر معمولی تقاضوں کے سامنے بے اختیار ہتھیار ڈالنے والے ہیں۔ اس کے برعکس جب ہم ٹیلیویژن پر وزیر خارجہ مسٹر بھٹو کو سیکیورٹی کونسل میں بڑھ چڑھ کر جوشیلی تقریریں کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو صورت حال بالکل مختلف نظر آتی تھی۔ مملکت کا سربراہ جلد از جلد جنگ بندی کی طرف مائل تھا۔ لیکن ان کا وزیر خارجہ اقوام متحدہ کی کونسل میں ہندوستان کے ساتھ طویل سے طویل یہاں تک کہ ہزار سالہ جنگ تک کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس تضاد اور تصادم میں قدرتی طور پر پلہ صدر ایوب کا ہی بھاری رہا۔ اور ۲۳ ستمبر کو جنگ بندی کا اعلان ہو گیا۔ جس طرح اس جنگ کے آغاز کے متعلق طرح طرح کی قیاس آرائیاں وقتاً فوقتاً اڑتی رہتی ہیں' اسی طرح اس کے اچانک اختتام پر بھی مختلف قسم کی قیاس آرائیوں کی گنجائش موجود ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کے دباؤ میں آ کر صدر ایوب حوصلہ ہار بیٹھے تھے۔ کسی کا خیال ہے کہ ہماری فوجی ہائی کمانڈ بھی اس لڑائی کا بوجھ

For more books visit www.4Urdu.com

اٹھانے سے معذور تھی' اور جلد از جلد اس جنگ کے جنجال سے باہر نکلنا چاہتی تھی' وغیرہ وغیرہ۔

سیز فائر کے اعلان کے بعد مسٹر بھٹو نیویارک سے واپسی پر لندن سے گزرے۔ لندن سے پاکستان جانے کے لیے وہ ایک ایسے ہوئی جہاز میں بیٹھے جو ہالینڈ کی ایئرپورٹ ایمسٹرڈم پر بھی رکتا تھا۔ ایمسٹرڈم کے ہوائی اڈے پر اتر کر انہوں نے مجھے ہیگ میں ٹیلیفون کر کے کہا۔ "میں یہاں پر صرف تم سے ملنے اترا ہوں۔ فوراً ایئرپورٹ پر آ جاؤ۔ اپنے سفارتخانے والوں کو ہرگز نہ بتانا کہ میں یہاں اترا ہوں۔ تم اکیلے آ جاؤ۔"

میں جلدی جلدی کار میں بیٹھ کر ایمسٹرڈم کے ہوائی اڈے پر پہنچا جو ہیگ سے بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ نہایت وسیع و عریض ایئرپورٹ ہے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ مسٹر بھٹو کو یہاں پر کسی خاص جگہ تلاش کروں کہ کے ایل ایم کے وی آئی پی مسافروں کی دیکھ بھال کرنے والی خاتون میری طرف بڑھی اور بولی۔ "آیئے' میں آپ کو آپ کے فارن منسٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔"

راستے میں اس خاتون نے کہا کہ جس جہاز سے مسٹر بھٹو کراچی جا رہے ہیں' وہ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد روانگی کے لیے تیار ہے۔ انہیں دس منٹ بعد ضرور جہاز پہ سوار ہو جانا چاہیے۔ آپ ان کے ساتھ سیڑھیوں تک جا کر الوداع کہہ سکتے ہیں۔" میں نے بھٹو صاحب کو یہ بات بتائی تو وہ بولے۔ "دراصل میں صرف دس بارہ منٹ باتیں کرنے کے لیے یہاں نہیں رکا۔ کیا یہ خوبصورت خاتون ایسا بندوبست نہیں کر سکتی کہ میں دو تین گھنٹے بعد کسی اور فلائٹ سے کراچی روانہ ہو سکوں۔"

کے ایل ایم کی میزبان خاتون نے مسکرا کر کہا۔ "نو پرابلم سر۔ اپنا ٹکٹ مجھے دیجئے۔ میں ابھی سارا انتظام کر کے آتی ہوں۔"

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بھٹو صاحب کا سامان نکلوایا اور تین گھنٹے بعد شام کے ساڑھے سات بجے ایک دوسری ہوائی کمپنی کی پرواز میں کراچی کے لیے ان کی نشست بھی محفوظ کرا لی۔ اس کے بعد اس نے کہا۔ "اگر آپ یہ وقفہ ایئر پورٹ پر ہی گزارنا چاہیں تو

For more books visit www.4Urdu.com

ہمارا وی آئی پی ریسٹ روم حاضر خدمت ہے۔

بھٹو صاحب نے کہا۔ "شکریہ' ہم کچھ دیر کے لیے باہر گھومنے جائیں گے۔ یہ خیال رکھئے کہ میں یہاں پر صرف اپنی ذاتی حیثیت سے رکا ہوں اس لیے پریس اور پروٹوکول والوں کو خبر نہ دیں' تاکہ ان کی خواہ مخواہ زحمت نہ ہو۔"

"نو پرابلم سر۔" میزبان خاتون نے کہا۔ "لیکن آپ سات بجے تک ضرور واپس آ جائیں۔ میں آپ کا سامان اگلی فلائٹ میں رکھوا کر آپ کے بورڈنگ کارڈ کے ساتھ اسی جگہ آپ سے ملوں گی۔"

ائیر پورٹ سے باہر آ کر میں نے بھٹو صاحب سے گلہ کیا کہ اگر وہ لندن سے روانہ ہونے سے پہلے مجھے ٹیلیفون کر دیتے تو میں یہ سارے انتظامات پہلے ہی سے کروا رکھتا۔ وہ بولے کہ یہاں کچھ دیر رکنا ان کا ذاتی فیصلہ تھا اور وہ اس کا چرچا کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ میری کار کا ڈرائیور کیا کیا زبانیں جانتا ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ وہ ہمارے سفارت خانے میں بالکل نیا ملازم ہوا ہے' صرف ولندیزی زبان جانتا ہے۔ ابھی تک اردو اور انگریزی سے قطعی ناواقف ہے۔

"بس یہ ٹھیک ہے" بھٹو صاحب خوش ہو کر بولے۔ "اب دو ڈھائی گھنٹے مجھے اپنی کار میں ایمسٹرڈم کی سیر کراؤ اور ہوائی جہاز کے وقت پر واپس ائیر پورٹ پہنچا دو۔"

ڈرائیور کو تاکید کر کے کہ ہم نے سات بجے سے پہلے واپس ائیرپورٹ پر پہنچنا ہے' ہم دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ کار ایمسٹرڈم کے خوبصورت اور خوشنما علاقوں سے گزرتی رہی لیکن مسٹر بھٹو نے کسی منظر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ وہ لگاتار بولے چلے جا رہے تھے اور ان کے سینے میں دبا ہوا تلخیوں کا لاوا ان کی گفتگو کی روانی میں بہہ بہہ کر مسلسل باہر نکل رہا تھا۔ اس میں صدر ایوب اور چند فوجی جرنیلوں کی کم ہمتی' کوتاہ اندیشی اور فن حرب کی مہارت کے فقدان کا رونا تھا' جنگ کے دوران چیدہ چیدہ مواقع پر ہماری حربی حکمت عملی کی ناکامیوں کا بیان تھا۔ قبل از وقت جنگ بندی پر کڑی نکتہ چینی تھی اور غالباً سانس لینے کے لیے وہ بار بار ٹیپ کا یہ بند دہراتے تھے

For more books visit www.4Urdu.com

کہ پہاڑ جیسی غلطیوں اور بلاوجہ ناکامیوں کے اس کاروبار میں وہ صدر ایوب کا مزید ساتھ نہیں دے سکتے' انہوں نے دو ٹوک طور پر تو یہ بات نہیں کہی لیکن ان کی گفتگو کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صدر ایوب کی کابینہ سے باہر نکلنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ اور مستقبل کے لیے اپنا ایک الگ سیاسی لائحہ عمل وضع کرنے کی فکر میں ہیں۔

ان کی باتیں سنتے سنتے میں اس شش و پنج میں بیٹھا رہا' کہ وہ ایمسٹرڈم میں رک کر خاص طور پر میرے سامنے یہ گفتگو کیوں کر رہے ہیں؟ ایک خیال تو مجھے یہ آیا کہ شاید وہ اپنے یہ خیالات صدر ایوب تک پہنچانے کے لیے مجھے آلہ کار بنانا چاہتے ہوں۔ دوسری بات مجھے یہ کھٹکی کہ شاید وہ اپنے نئے سیاسی لائحہ عمل کے بارے میں مجھ سے کوئی رائے یا مشورہ لینے آئے ہوں۔ میں نے اپنے یہ دونوں مفروضے ان کو بتائے تو وہ ہنسنے لگے اور میرا ہاتھ دبا کر بولے۔ "ارے بھائی میں ان میں سے کسی مقصد کے لیے نہیں آیا۔ میں صرف اس لیے یہاں رکا ہوں کہ تمہارے ساتھ صاف گوئی سے باتیں کر کے اپنے دل کا غبار نکال لوں کیونکہ مجھے مکمل اعتماد ہے کہ تم میری باتیں اپنے تک ہی رکھو گے اور ان کا کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ گے۔"

مجھے خوشی ہے کہ میں نے بھٹو صاحب کے اعتماد کو پورا پورا نبھایا' اور آج اس واقعہ کو قلم بند کرنے سے پہلے کسی کے ساتھ اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

کار میں بیٹھے بیٹھے ہم دونوں اس گفتگو میں اس درجہ محو تھے کہ ہمیں وقت کا خیال ہی نہ رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے چھ بجے کا عمل تھا۔ ابھی ایئرپورٹ چار پانچ میل دور تھی اور ہماری کار نہایت ست رفتاری سے سڑک پر رینگتی ہوئی جا رہی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کے ہجوم کا وقت (Rush Hour) اپنے عروج پر تھا اور ہم اپنے آگے پیچھے' دائیں بائیں ہزاروں موٹرکاروں کے اژدہام میں بری طرح گھرے ہوئے تھے۔ ان حالات میں ہمیں ایئرپورٹ تک پہنچنے میں کئی گھنٹے لگنے کا اندیشہ تھا۔ ڈرائیور نے عقلمندی سے کام لیا اور کار کی ہنگامی بتیاں ٹمٹما کر ایک ٹریفک سارجنٹ کو اپنی طرف

For more books visit www.4Urdu.com

متوجہ کیا' پھر گاڑی سے اتر کر اس نے ٹریفک سارجنٹ سے کچھ گفتگو کی اور دیکھتے ہی دیکھتے موٹر سائیکلوں پر سوار ٹریفک پولیس کے چند سپاہیوں نے ہماری کار کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ فائر بریگیڈ کی طرح ہنگامی سائرن بجاتے وہ ہمارے آگے پیچھے تیز رفتاری سے روانہ ہو گئے۔ ان کی آواز پر سڑکوں پر چھایا ہوا ہجوم چھٹتا گیا اور ہم ٹریفک کی سرخ بتیوں سے بھی گزرتے ہوئے چند منٹ میں ائیرپورٹ پہنچ گئے۔ وہاں پر ڈچ وزارت خارجہ کے ایک پروٹوکول افسر نے لپک کر بھٹو صاحب کا خیر مقدم کیا۔ کے۔ ایل۔ ایم کی میزبان خاتون نے معذرتانہ انداز میں کہا۔ "سر میں نے کسی کو آپ کے متعلق بالکل کچھ نہیں بتایا۔ آپ مشہور شخصیت ہیں' آپ کی نقل و حرکت سب کو معلوم ہو جاتی ہے۔"

جنگ بندی کے بعد ہی یہ خبریں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں کہ روس یہ کوشش کر رہا ہے کہ قضیہ کشمیر اور جنگ سے پیدا شدہ دیگر مسائل حال کرنے کے لیے وہ اپنی نگرانی میں بھارت اور پاکستان کے مذاکرات کروائے۔ رفتہ رفتہ یہ معلوم ہوا کہ مذاکرات منعقد ہونے کے لیے تاشقند کا مقام تجویز ہو رہا ہے۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے صدر ایوب کو ایک طویل خفیہ تار دی کہ اگر واقعی ایسی کوئی تجویز آپ کے زیر غور ہے' تو آپ اسے فوراً رد کر دیں۔ کشمیر کے تنازعہ میں روس ہمارے خلاف اور ہندوستان کے حق میں بار بار اپنا ویٹو استعمال کر چکا ہے۔ اب روس کی سرکردگی میں اور اس کی سرزمین پر اس بارے میں جو بھی مذاکرات ہوں گے' ان میں حالات اور ماحول کا زیادہ سے زیادہ دباؤ اور جھکاؤ بھارت ہی کے حق میں جانے کا خدشہ ہے۔ اگر ہم نے اس دباؤ اور جھکاؤ کے خلاف زیادہ ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی تو یقیناً روس ہمارا مزید دشمن ہو جائے گا۔ ہمارے موجودہ حالات میں ہمیں روس کی مزید دشمنی مول لینا ہرگز مناسب نہیں۔

اس تار میں دوسری بات میں نے یہ لکھی تھی کہ اب تک تنازعہ کشمیر کی اصلی عدالت یو۔ این۔ او کی سیکیورٹی کونسل رہی ہے' وہیں پر تمام بحث مباحثے ہوئے ہیں اور وہیں

For more books visit www.4Urdu.com

پر سب قرار دادیں منظور ہوئی ہیں جو تمام کی تمام ہمارے حق میں ہیں۔ ہمارے مفادات کا تقاضا ہے کہ ہم یہ مقدمہ اسی عدالت میں قائم رہنے دیں۔ اگر ایک بار یہ معاملہ کسی اور فورم مثلاً تاشقند میں منتقل ہو گیا تو اس کی نوعیت بالکل بدل جائے گی۔ سیکیورٹی کونسل کی تمام پچھلی قراردادیں متروک الاستعمال ہو جائیں گی اور رفتہ رفتہ فرسودگی اور دقیانوسیت کی گرد میں دب کر عملاً منسوخ اور کالعدم سمجھی جائیں گی۔ مستقبل میں ہمارے پاس کشمیر کی بابت صرف وہی حوالہ باقی رہ جائے گا جو مذاکرات تاشقند فراہم کریں گے۔ ایسی صورت حال ہمارے موقف کشمیر کے لیے انتہائی زوال پذیر رجعت پذیری ثابت ہو گی۔

اس تار میں تیسری بات یہ درج تھی کہ کشمیر کے معاملے میں اگر روس بھارت اور پاکستان کے مابین اپنی خیر سگالی کا مظاہرہ کرنا ہی چاہتا ہے' تو یہ مذاکرات یو۔ این۔ او میں سیکیورٹی کونسل کے زیر اہتمام منعقد ہونے چاہئیں۔ وہاں پر روس کو بھی ضرور خصوصی طور پر مدعو کیا جائے تاکہ وہ اپنی خیر سگالی کا برملا عمل اظہار کرنے میں پورا پورا آزاد ہو۔

صدر ایوب نے تو میری اس ٹیلیگرام کا کوئی جواب نہ دیا' لیکن چند روز بعد ہماری وزارت خارجہ سے میرے نام ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ میری تار پڑھ کر صدر ایوب نے اس پر یہ نوٹ تحریر فرمایا تھا۔

"There is a Lot of Sense in what he says?"

صدر کا یہ نوٹ پڑھ کر مجھے ہلکی سی امید بندھ گئی کہ شاید میری معروضات نے ان کے دل پر کچھ اثر کیا ہے اور وہ میرے مشورے پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہوں گے۔ لیکن یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی' کیونکہ چند ہفتوں کے بعد یہ خبر آئی کہ ۳ جنوری ۱۹۶۶ء کو پاکستان کا وفد صدر ایوب کی قیادت میں تاشقند پہنچ گیا ہے۔ بھارتی وفد کے سربراہ وزیراعظم لال بہادر شاستری تھے۔

مذاکرات تاشقند آٹھ روز جاری رہے اس موضوع پر بھی کوئی مستند اور جامع دستاویز ابھی

For more books visit www.4Urdu.com

تک ہمارے سامنے نہیں آئی۔ چند راویوں سے جو ہمارے وفد میں شامل تھے' میں نے اتنا سنا ہے کہ ابتدائی چند ایام تعطل کا شکار رہے۔ کیونکہ شاستری جی نے ان مذاکرات میں کشمیر کا ذکر شامل کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ کشمیر پہلے ہی سے طے شدہ مسئلہ ہے' اور یہ مذاکرات صرف ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ہو رہے ہیں جو حالیہ جنگ سے پیدا ہوئے ہیں۔ غالباً روسیوں کی مداخلت سے شاستری جی کسی قدر پسیجے اور پاکستانی وفد کو ان مذاکرات کے دوران کشمیر کا نام لینے کی اجازت مل گئی۔ البتہ بھارتی وزیراعظم کا رویہ بدستور سخت اور بے لوچ رہا' ان کے نزدیک یہ مسئلہ طے ہو چکا ہوا تھا اور اب اسے ازسر نو چھیڑنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وزیر خارجہ مسٹر بھٹو کا خیال تھا کہ ایسے حالات میں یہ مذاکرات بے مقصد ہوں گے اور پاکستانی وفد کو بغیر کوئی معاہدہ کیے واپس لوٹ جانا چاہیے۔ شروع میں صدر ایوب بھی غالباً اسی خیال سے متفق تھے۔ لیکن روسی وزیراعظم مسٹر کوسیجن نے صدر ایوب سے پے در پے چند ملاقاتیں کر کے ان پر کچھ ایسا جادو کیا کہ ان کا رویہ ڈرامائی طور پر بدل گیا۔ اور وہ دفعتہ اس بات کے حامی ہو گئے کہ کسی معاہدہ پر دستخط کیے بغیر ہمیں تاشقند سے واپس جانا زیب نہیں دیتا۔

مذاکرات کے دوران کسی نکتے پر مسٹر بھٹو نے صدر ایوب کو کچھ مشورہ دینے کی کوشش کی تو صدر کا ناریل اچانک چٹخ گیا۔ انہوں نے غصے میں مسٹر بھٹو کو اردو میں ڈانٹ کر کہا "الو کے پٹھے بکواس بند کرو۔"

مسٹر بھٹو نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا "سر' آپ یہ ہرگز فراموش نہ کریں کہ روسی وفد میں کوئی نہ کوئی اردو زبان جاننے والا بھی ضرور موجود ہو گا۔"

میرا اندازہ ہے کہ غالباً یہی وہ نکتہ آغاز ہے جہاں سے صدر ایوب اور ذوالفقار علی بھٹو کے راستے عملی طور پر الگ الگ ہو گئے۔

وزیراعظم کوسیگن نے صدر ایوب پر کیا جادو چلایا یا کیا دباؤ ڈالا' اس کا ہمیں اب تک

For more books visit www.4Urdu.com

کوئی سراغ نہیں ملا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں رہنماؤں کی ایک یا دو ملاقاتیں ایسی تھیں جن میں ہمارے وفد کا کوئی اور رکن موجود نہ تھا۔ شاید اسی بات کی آڑ لے کر مسٹر بھٹو نے صدر ایوب کے خلاف اپنی مہم میں یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ معاہدہ تاشقند میں کچھ ایسے امور بھی پوشیدہ ہیں جو ابھی تک صیغہ راز میں ہیں اور وہ بہت جلد ان کا بھانڈہ پھوڑنے والے ہیں۔ میرے خیال میں یہ محض ایک سیاسی شعبدہ بازی تھی جسکا مقصد صدر ایوب پر ایک عامیانہ الزام تراشی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یوں بھی صدر ایوب کی معزولی کے بعد مسٹر بھٹو نے اس تہمت کی طرف اشارہ تک کرنا چھوڑ دیا تھا' کیونکہ انہیں بخوبی علم تھا کہ یہ الزام شروع ہی سے بے بنیاد تھا۔

۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو وزیراعظم شاستری اور صدر ایوب نے معاہدہ تاشقند پر دستخط کر دیئے اور مسٹر کوسیجن نے اس پر اپنی گواہی ثبت کر دی۔ اس کے بعد خوشی منانے کی غرض سے دو تقریبات منعقد ہوئیں۔ ایک تو بین الاقوامی صحافیوں کی پریس کانفرنس کا استقبالیہ۔ دوسرا مسٹر کوسیجن کا دونوں وفود کے لیے ایک شاندار ڈنر۔ ان دونوں تقریبات میں پاکستانی وفد کے اراکین کسی قدر بجھے بجھے اور افسردہ دل تھے۔ لیکن بھارتی اراکین خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے' اور پھدک پھدک کر' چہک چہک کر اپنی شادمانی اور مسرت کا برملا اظہار کر رہے تھے۔ لال بہادر شاستری صاحب بھی فخر و انبساط سے سرشار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈنر کے بعد جب وہ اپنے ولا (Villa) میں واپس گئے تو کچھ دیر ٹیلیفون پر دہلی سے باتیں کرتے رہے۔ غالباً اپنی کامیابی اور فتحیابی کی خبر دے رہے ہوں گے۔ اس کے بعد شادی مرگ نے انہیں آ دبوچا اور دو تین گھنٹوں کے اندر اندر دل کی حرکت بند ہو جانے سے وفات پا گئے۔

دو تین روز بعد ہالینڈ کے ایک اخبار میں معاہدہ تاشقند کی تفصیلات پڑھیں۔ ساتھ ہی ایک فوٹو دیکھی جس میں صدر ایوب روسی وزیراعظم کے ہمراہ لال بہادر شاستری کے تابوت کو کندھا دے کر دہلی جانے والے ایک جہاز کی طرف جا رہے تھے۔ اس تابوت میں صرف شاستری جی کا جسد خاکی ہی نہ تھا۔ بلکہ اس میں مسئلہ کشمیر پر یو۔ این۔ او میں ہماری

For more books visit www.4Urdu.com

تمام پیش رفت بھی لپیٹ کر مقفل کر دی گئی تھی۔ کیونکہ ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کے بعد مسئلہ کشمیر کا حوالہ سیکیورٹی کونسل کی قرار دادیں نہ رہی تھیں' بلکہ معاہدہ تاشقند کی وہ شق رہ گئی تھی جس میں ریاست جموں و کشمیر کا ذکر محض ضمنی طور پر اس طرح آیا تھا:

URDU4U.COM

"The prime Minister of India and the President of pakistan agree that both sides will exert all efforts to create good neighbourly relations between India and Pakistan in accordance with the United Nations Charter، they reaffirm their obligation under the Charter not to have recourse to force and settle their disputes through peaceful means."

"They considered that the interest of peace in the region and particularly in the Indo-Pakistan Subcontinent and indeed، the interests of the people of India and pakistan were not served by the continuance of the tension between the two countries. It is against this background that Jammu and Kashmir was discussed، and each of the sides put forth its respective position."

ہندوستان کے علاوہ معاہدہ تاشقند کا اصلی ثمر روس کے حصے میں بھی آیا۔ یہ مذاکرات اپنی سرزمین پر منعقد کرانے میں روس کی پیش قدمی میں غالباً یہ دعویٰ بھی مضمر تھا کہ حق ہمسائیگی کے طور پر جنوبی ایشیا کے معاملات اس کے حلقہ اثر کا جزو لاینفک ہیں۔ سپر پاور کے درمیان دنیا میں اپنے اپنے حلقہ اثر کی بندر بانٹ کے حوالے سے یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ امریکہ نے روس کے اس خاموش لیکن واضح دعوے کو بلا چوں و چرا تسلیم بھی کر لیا۔

۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو مسئلہ کشمیر معاہدہ تاشقند کے تابوت میں ڈال دیا گیا تھا۔ چھ برس بعد

For more books visit www.4Urdu.com

۱۹۷۲ء کو معاہدہ شملہ نے اس تابوت میں ایک اور کیل ٹھونک دی۔ یہ کیل ان الفاظ کے ساتھ گاڑی گئی تھی:

In Jammu and Kashmir، the Line of Control resulting from the cease fire of December ۱۹۷۱ shall be respected by both sides without prejudice to the recognised position of either side. Neither side shall seek to alter it unilaterally، irrespective of mutual differences and legal interpretations. Both sides further undertake to refrain from threat or the use of force in violation of this Line.

اس کے بعد رفتہ رفتہ اب یہ نوبت آ گئی ہے' کہ اگر ہم کسی بین الاقوامی پلیٹ فارم پر تنازعہ کشمیر کا نام تک بھی لیں' تو بھارتی حکمران سیخ پا ہو کر ہم پر گرجنے برسنے لگتے ہیں کہ ہم ان کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کیوں کر رہے ہیں؟
مجموعی طور پر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ فیلڈ مارشل ایوب خاں کے عہد کا ایک انتہائی اہم سنگ میل ہے۔ اس موقع پر پوری قوم نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ لیکن ان کے فوجی مشیروں کی ہمت اور اہلیت قوم کی توقعات پر پوری نہ اتر سکی۔ ان کے دیرینہ حلیف امریکہ اور برطانیہ نے ان کے ساتھ بے وفائی کی۔ تاشقند میں روس نے ان پر یقیناً کسی نہ کسی قسم کا دباؤ ڈالا۔ معاہدہ تاشقند میں مسئلہ کشمیر کو اس کی بنیادی پٹڑی سے اتار کر کھٹائی میں ڈال دیا گیا۔ اس کے خلاف ملک میں شدید ردعمل کی رو ابھری۔ اور اسی کے ساتھ صدر ایوب کے زوال اقتدار کے آثار مرتب ہونا شروع ہو گئے۔

○ امریکہ

اقتدار میں آنے سے بہت عرصہ قبل ہی ایوب خاں صاحب امریکہ پرستی کے بین الاقوامی فیشن ایبل مرض میں مبتلا ہو چکے تھے۔ بری افواج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے انہوں نے پاکستانی حکومت سے بالا بالا واشنگٹن میں امریکی فوجی ہیڈ کوارٹر Pentagon سے

For more books visit www.4Urdu.com

نہایت گہرے دوستانہ روابط قائم کر رکھے تھے۔ امریکی فوجی لیڈروں کے اثر و رسوخ کے تحت اور ان کی رہنمائی میں ہمارے کمانڈر انچیف نے اپنی افواج کو اس طور پر منظم آراستہ اور مسلح کرنا شروع کیا کہ آئندہ ہمیں امریکہ کی فوجی امداد کے بغیر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا یا متبادل دفاعی حکمت عملی اختیار کرنا محال ہی نہیں بلکہ نا ممکن ہو گیا۔

۱۹۵۵ء میں امریکہ نے "بغداد پیکٹ" کے نام سے مشرق وسطیٰ میں روس کے خلاف محاذ آرائی کا ڈول ڈالا تو دنیائے عرب میں اس کے خلاف شدید ردعمل پیدا ہوا۔ ایران اور ترکی پہلے ہی اپنے اپنے طور پر امریکہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کئے بیٹھے تھے۔ اس لیے "بغداد پکیٹ" میں ان کی شمولیت کوئی حیران کن بات نہ تھی۔ عراق میں وزیراعظم نوری السعید اور ان کی ہمخیال ٹولہ صدر ناصر کی اندھا دھند دشمنی میں حواس باختہ ہو کر امریکن ترغیبات کی بنسی میں ایک کینچوے کی طرح لٹکا ہوا تھا اور "بغداد پکیٹ" کی میزبانی کا شرف حاصل کر کے عرب دنیا میں انتشار اور نفاق کا بیج بو رہا تھا۔ اس وقت پاکستان کو ایسی کوئی خاص مجبوری لاحق نہیں تھی کہ وہ دنیائے عرب کی ناراضگی مول لے کر خواہ مخواہ اس پکیٹ میں شامل ہوتا۔ یوں بھی اس معاہدے کے ساتھ پاکستان کا کوئی فوری مفاد وابستہ نہ تھا کیونکہ ہمارے ابدی دشمن نمبر ایک یعنی بھارت کی طرف سے پاکستان پر حملے کی صورت میں یہ معاہدہ ہمارے دفاع کی کوئی ذمہ داری قبول نہ کرتا تھا۔ تاہم بری فوج کے کمانڈر انچیف کے دباؤ میں آ کر حکومت پاکستان بغیر سوچے سمجھے اس پکیٹ میں شامل ہو گئی۔

عراق میں انقلاب کے بعد بغداد تو اس پکیٹ سے خارج ہو گیا اور یہی معاہدہ سینٹو یعنی (Central Treatry Organization) کا لبادہ اوڑھ کر انقرہ منتقل ہو گیا۔ اس نئی ہیئت میں بھی ہم بدستور اس پکیٹ کے ساتھ چپکے رہے۔ اس عمل میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ اس کا اندازہ صرف ایڈ' ٹریڈ' توپ و تفنگ اور گولہ بارود کے گوشواروں سے نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کا اصلی جائزہ لینا تو اس وقت ممکن ہو گا جب آزادی اقوام کے

For more books visit www.4Urdu.com

آئینے میں وطن عزیز کے واقعات و شواہد تاریخ کی چھلنی سے گزر کر اپنے صحیح پس منظر اور پیش منظر میں رکھے جا سکیں گے۔ فی الحال صرف یہی کہنا کافی ہو گا کہ "بغداد پکیٹ" عرف سینٹو میں پاکستان کی شمولیت نے مسئلہ کشمیر کو زبردست دھچکا پہنچایا اس معاہدے میں شمولیت سے پہلے جب کبھی یہ تنازعہ یو۔ این۔ او میں پیش ہوتا تھا تو اس پر روس کا رویہ غیر جانبدارانہ رہا کرتا تھا۔ اور سیکیورٹی کونسل میں رائے شماری کے دوران روسی نمائندہ کسی جانب بھی ووٹ ڈالنے سے اجتناب برتا کرتا تھا۔ لیکن اس پکیٹ میں ہمارے شامل ہوتے ہی روس نے مسئلہ کشمیر پر اپنا رویہ مکمل طور پر بدل لیا اور وہ اس موقف پر اڑ گیا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ حصہ ہے اور وہاں پر اب کسی قسم کا استصواب رائے کروانا ضروری ہے اور نہ ہی ممکن ہے۔ سیکیورٹی کونسل میں بھی روس نے اس معاملے میں پاکستان کے خلاف ویٹو استعمال کرنا شروع کر دیا۔

سینٹو CENTO کی طرح سیٹو SEATO بھی ایک دوسرا فوجی معاہدہ تھا جو خواہ مخواہ مفت میں ہمارے سر بڑا عرصہ منڈھا رہا۔ سیٹو (ساؤتھ ایسٹ ایشیا ٹریٹی آرگنائزیشن) بھی امریکہ کی رہنمائی میں مغربی مفاد پرستی کا ایک حربہ تھا جو جنوب مشرقی ایشیا میں چین کی ناکہ بندی کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ اس میں ہماری شمولیت بھی نہ پاکستان کے لیے ضروری تھی نہ سود مند تھی۔

اس زمانے میں یہ افواہ بھی گرم تھی کہ ستمبر ۱۹۵۴ء میں جب اس معاہدہ پر غور و خوض کے لیے متعلقہ ممالک کی کانفرنس منیلا میں منعقد ہوئی تو اس میں پاکستان کے وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خاں کو محض آبزرور (Observer) کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ حکومت پاکستان نے انہیں اس بات کی اجازت نہ دی تھی کہ وہ اس معاہدہ میں پاکستان کی شمولیت تسلیم کر کے آئیں۔ لیکن کسی وجہ سے چوہدری ظفر اللہ خاں نے خود اپنی صوابدید پر اس معاہدہ پر دستخط کر دیے تھے اور اسی طرح کی کسی اور وجہ سے کانفرنس کے شرکا نے فل پاور Full Power کے بغیر ان کے دستخط قبول بھی کر لیے۔ اگر یہ افواہ

For more books visit www.4Urdu.com

واقعی صحیح ہے تو یہی سمجھنا چاہیے کہ بچارے پاکستان کو زبردستی ایک ناپسندیدہ اور غیر نافع بین الاقوامی معاہدے میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

URDU4U.COM

میں نے صدر ایوب سے درخواست کی کہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں وزارت خارجہ اور کابینہ کے ریکارڈ دیکھ کر اس افواہ کی تصدیق یا تردید کر سکوں جو ہر دور میں ایک نیا رنگ لے کر زبان زد خاص و عام ہوتی رہتی ہے۔ انہوں نے بخوشی اجازت دے دی لیکن وزارت خارجہ اور کیبنٹ سیکرٹریٹ والوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا ایہ اطلاع صدر مملکت نے کسی سرکاری حوالے کے لیے طلب فرمائی ہے یا میں یہ تفتیش صرف اپنی ذاتی حیثیت سے کر رہا ہوں۔ میں نے سچ سچ تسلیم کر لیا کہ یہ اطلاع صدر ایوب نے کسی سرکاری غرض کے لیے طلب نہیں کی۔ اس پر ان دونوں دفاتر کے بابو صفت افسر دفتری معاملات کو صیغہ راز میں رکھنے والے بے معنی اور فرسودہ قواعد و ضوابط کی آڑ میں چپ سادھ کر بیٹھ گئے۔ آزاد دنیا کے مہذب ممالک میں خفیہ سے خفیہ راز ہائے سر بستہ کو بھی کم و بیش تیس برس گزرنے کے بعد برسر عام فاش کر دیا جاتا ہے تاکہ قومی تاریخ کی تدوین و تصدیق کے تقاضے ہر زمانے میں بعنوان شائستہ پورے ہوتے رہیں۔ سیٹو میں بھی ہماری شمولیت کو اب کوئی تیس برس ہوا چاہتے ہیں۔ امید رکھنی چاہیے کہ اب حکومت پاکستان اس موضوع پر متعلقہ کاغذات اور دستاویزات منظر عام پر لانے میں پس و پیش نہ کرے گی۔ تاکہ تاریخ کے طالب علم ان سے کھلے بندوں استفادہ کر سکیں۔ اور اس سلسلے میں اگر کسی غلط افواہ نے وقتہ فوقتہ سر اٹھایا ہے تو اس کا مناسب سدباب ہو سکے۔

جب ہم نے بغداد پکیٹ (سینٹو) اور سیٹو میں شمولیت اختیار کی تو ہمارے خلاف بھارت میں بھی شدید واویلا مچایا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ الزم لگایا کہ ان معاہدوں میں شامل ہو کر ہم سپر پاورز کی باہمی "سرد جنگ" کو پاک بھارت برصغیر کی حدود میں کھینچ لائے ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ امریکی ڈالروں کی چمک دمک سے تو ہماری آنکھیں روز اول ہی

For more books visit www.4Urdu.com

سے خیرہ ہو رہی تھیں۔ لیکن خود امریکیوں کی نگاہ میں پاکستان کی حقیقی قدر و قیمت کیا تھی' اس کا اندازہ تاریخی واقعات اور شواہد کی روشنی ہی میں لگایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں دو باتوں کو ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیے۔ ایک تو یہ کہ امریکہ ایک نہایت عظیم سپر پاور ہے۔ اس کی طاقت' عظمت اور خوشحالی کا انحصار نہ پاکستان کے وجود پر ہے اور نہ ہی پاکستان کی خیر سگالی اور خوشنودی پر ہے۔ پاکستان کے ساتھ امریکہ کی دلچسپی' دوستی اور گرمجوشی وقتہ فوقتہ صرف اسی حد تک قائم ہو سکتی ہے جس حد تک کہ ہم عالمی بساط سیاست پر شطرنج کے مہرے کی طرح اس کے لیے کار آمد ثابت ہوتے رہیں گے۔ ہماری اسی افادیت کے اتار چڑھاؤ پر ہمیں کبھی امریکی فوجی یا معاشی امداد ملنے لگتی ہے کبھی بند ہو جاتی ہے یا کبھی اس میں ترمیم و تجدید یا تخفیف و تعویل ہوتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ امریکن ایڈ کا کوئی پیمانہ قابل عمل نہیں اور قابل اعتبار نہیں کیونکہ لین دین کے اس کاروبار میں کسی اصول' خلوص یا مروت کا بالکل کوئی عمل دخل نہیں۔ دوسری بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے' یہ ہے کہ ہر امریکی حکومت میں عموماً یہودیوں کا عنصر کافی حد تک غالب رہتا ہے۔ اسلام کے حوالے سے یہودی پاکستان کے ازلی اور ابدی دشمن ہیں اور اپنے مفاد کے محدود تقاضوں کے علاوہ اس کی کوئی مزید مدد کرنا کبھی قبول یا گوارا نہ کریں گے۔

کمانڈ انچیف کی حیثیت سے جنرل ایوب خاں نے امریکن فوجی ہیڈ کوارٹر کے ساتھ جو پینگیں بڑھائی تھیں' ان کا ایک منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان ایک فوجی معاہدہ طے کرنے کی گفت و شنید شروع ہو گئی۔ اسی زمانے میں پاکستان کے وزیراعظم محمد علی بوگرا نے کافی دوڑ دھوپ کے بعد طرح طرح کے ہاتھ پاؤں مار کر پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ مسئلہ کشمیر پر گفتگو کرنے کے لیے دہلی میں ایک ملاقات کا راستہ ہموار کیا اس ملاقات کے بعد اگست ۱۹۵۳ء میں دونوں وزرائے اعظم نے ایک مشترکہ اعلان جاری کیا جسمیں واشگاف طور پر اپنے اس موقف کا اعادہ کیا گیا تھا کہ تنازعہ

For more books visit www.4Urdu.com

کشمیر ریاست کے عوام کی خواہشات کے مطابق حل کیا جائے گا۔ اور کشمیری عوام کی خواہشات ایک منصفانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ذریعے معلوم کی جائے گی۔

URDU4U.COM

ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا گیا تھا کہ آٹھ ماہ کے اندر اندر ایک (Plebiscite Administrator) بھی تعینات کر دیا جائے گا۔ لیکن جونہی پنڈت جواہر لال نہرو کے کان میں یہ بھنک پڑی کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان کوئی دفاعی معاہدہ طے ہو رہا ہے' وہ فوراً قلابازی کھا کر اپنے اس اعلان اور فیصلے سے بے حجابانہ مکر گئے۔ انہوں نے انتہائی سخت اور تند لہجے میں وزیراعظم محمد علی بوگرا کو لکھا کہ اگر پاکستان نے امریکہ کے ساتھ کوئی فوجی معاہدہ طے کیا تو پاک بھارت تعلقات پر نہایت مضر اور ناخوشگوار اثر پڑے گا اور تنازعہ کشمیر کے متعلق پچھلے تمام فیصلے اور سمجھوتے کالعدم تصور کیے جائیں گے۔ ہندوستان کی اس بے جا غوغا آرائی کے باوجود پاکستان اور امریکہ کے درمیان ایک دفاعی معاہدہ پر جو (Mutual Defence Assistance Agreement) کے نام سے موسوم تھا مئی ۱۹۵۴ء میں دستخط ہو گئے۔ پاکستان ایشیا کا واحد ملک تھا جو بھارت کی شدید ناراضگی مول لے کر اور کشمیر میں استصواب رائے کے متفقہ فیصلے سے ہاتھ دھو کر امریکہ کے ساتھ فوجی معاہدے میں منسلک ہوا تھا۔ روس کی ناراضگی مول لے کر اور مسئلہ کشمیر میں روس کی شدید مخالفانہ روش اختیار کرنے کے باوجود بغداد پکیٹ عرف دینٹو کا رکن بنا۔ اور چین کی ناراضگی کا خطرہ مول لے کر سیٹو کی رکنیت اختیار کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب "ہندی چینی بھائی بھائی" کا نعرہ ہندوستان کے طول و عرض میں اپنے پورے عروج پر گونج رہا تھا۔ پاکستان نے امریکہ کے ساتھ اپنی اس عاجزانہ وفاداری اور فدویانہ اطاعت شعاری کو جس خلوص' نیاز مندی اور پابندی سے نبھایا وہ ہماری مجبوری یا معذوری یا کوتاہ اندیشی تھی۔ لیکن جواباً امریکہ نے وقتہ فوقتہ ہمیں جس سلوک سے نوازا اسے بیان کرنے کے لیے ایک سپر پاور کے پاس کوئی الفاظ ہوں' تو ہوں' عام انسانیت کا نصاب اخلاق ان الفاظ سے قطعی کورا ہے۔

پانچ برس بعد ۱۹۵۹ء میں پاکستان اور امریکہ کے مابین ایک باہمی تعاون کا معاہدہ طے پایا

For more books visit www.4Urdu.com

Bilateral Agreement of Co- operation between the united States of America and Pakistan جس کی ایک سہم شق یہ تھی کہ اگر پاکستان پر کوئی جارحانہ حملہ ہوا تو امریکہ اس کی مدد پر آئے گا۔ اس معاہدے کی خبر پاتے ہی بھارت نے امریکہ کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ بہت جلد پنڈت نہرو نے لوک سبھا میں ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا کہ امریکہ حکومت نے انہیں یقین دہانی دلا کر ضمانت دی ہے کہ اس معاہدے کا اطلاق ہندوستان پر نہیں ہو گا۔ دوسرے الفاظ میں بھارت کو کھلی آزادی تھی کہ وہ جب چاہے اور جتنی بار چاہے پاکستان پر حملہ آور ہوتا رہے۔ امریکہ اپنے حلیف پاکستان کی ہرگز کوئی مدد نہ کریگا۔ درحقیقت ہوتا بھی یونہی رہا ہے۔ اسی زمانے میں کسی غیر ملکی صحافی نے صدر ایوب سے سوال کیا تھا کہ اگر آپ کی ہندوستان کے ساتھ جنگ چھڑ جائے' تو کیا آپ بھارت کے خلاف وہ اسلحہ استعمال کر سکیں گے جو کسی معاہدہ کے تحت امریکہ سے حاصل کیا گیا؟ صدر ایوب نے سیدھا دو ٹوک یہ جواب دیا تھا کہ فوجی اسلحہ جنگ کی صورت میں استعمال کرنے کے لیے ہی حاصل کیا جاتا ہے۔ کچی روئی (Cotton Wool) میں لپیٹ کر رکھا نہیں جاتا۔ اس پر امریکی سفارتخانہ بڑا برہم ہوا تھا۔ بلکہ ایک پارٹی میں کسی امریکن سفارتخانے نے تندی و تلخی سے یہ پھبتی اڑائی تھی کہ ہم نے صدر ایوب کی یہ بات سنی ہی نہیں کیونکہ اس وقت ہم اپنے کانوں میں کچی روئی ٹھونسے بیٹھے تھے۔

صدر کینڈی کی دعوت پر صدر ایوب نے جولائی ۱۹۶۱ء میں امریکہ کا دورہ کرنا تھا۔ اس دورے میں ہمارے صدر کی تقاریر اور گفت و شنید کے موضوعات متعین کرنے کے لیے مختلف وزارتوں سے تجاویز طلب کی گئیں۔ اور ان تجاویز پر غور کرنے کے لیے متعلقہ وزیروں کی ایک میٹنگ بھی منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ کی کارروائی دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا۔ کیونکہ ان سب تجاویز کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ صدر ایوب اپنے دونوں ہاتھوں میں کشکول گدائی اٹھائے امریکہ جائیں اور منت سماجت' خوشامد اور چاپلوسی کی باتیں کر کے امریکیوں کی خودپسندی کو تقویت دیں اور اپنی جھولی میں امریکی امداد کی رقم بڑھوا

For more books visit www.4Urdu.com

کر فتح و نصرت کے شادیانے بجاتے گھر واپس آ جائیں۔ ڈالروں کی ریل پیل بڑھنے کی توقع اور امکان پر صدر ایوب کے منہ میں بھی پانی بھر آیا' اور وہ غلامانہ ذہنیت کی ان تجاویز پر نہایت خوشدلی سے اثبات میں سر ہلاتے رہے۔

URDU4U.COM

یہ میٹنگ ختم ہوئی تو وزارت خارجہ کے سیکرٹری ایس کے دہلوی اور سیکرٹری اطلاعات نذیر احمد میرے کمرے میں آئے۔ وہ دونوں بھی اس میٹنگ کے رنگ ڈھنگ پر سخت برہم تھے۔ ان کا وسیع تجربہ' قابلیت اور جذبہ حب الوطنی اس قدر جوش میں آیا ہوا تھا کہ ان کا اصرار تھا کہ اگر صدر ایوب اسی طرح کاسہ گدائی ہاتھ میں لے کر امریکہ گئے تو وہ اپنے اپنے عہدوں سے سبکدوش ہونے کے لیے تیار ہیں۔ اس رات ہم تینوں میرے گھر میں ساری شب بیٹھے رہے۔ اور ہم نے صدر کے دورہ امریکہ کے لیے ایک نیا بریف (Brief) تفصیل سے تیار کر لیا۔ اس کا لب لباب یہ تھا کہ صدر کو ایک آزاد مملکت کے باوقار سربراہ کی حیثیت سے امریکہ کا دورہ کرنا چاہیے اور پاکستان کے مسائل اور مشکلات کو حسن تدبر اور بے باکی سے امریکی عوام' حکومت اور کانگرس کے سامنے بیان کرنا چاہیے۔ جہاں تک امریکہ امداد کا تعلق ہے' وہ ہاتھ پھیلا کر مانگنے سے نہیں ملتی۔ بلکہ امریکہ کے اپنے مفاد کے پیمانے سے ناپ کر دی جاتی ہے۔ امریکہ کے اس دورے کا بنیادی مقصد یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس کے ذریعہ وطن عزیز کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو اور بین الاقوامی سطح پر ہماری عزت نفس بڑھے۔

چونکہ اس زمانے میں میں صدر ایوب کے سیکرٹری کے طور پر متعین تھا' اس لیے میری ڈیوٹی لگی کہ یہ نوٹ میں خود جناب صدر کی خدمت میں پیش کروں۔ اس پر دستخط ہم تینوں نے کیے تھے۔

صبح سویرے دفتر پہنچ کر میں نے یہ نوٹ صدر ایوب کے پاس بھیج دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد میرے انٹر کام (Intercom) کا بلب ٹمٹمایا جس کا مطلب تھا کہ صدر صاحب خود ٹیلیفون پر ہیں۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو وہ غضبناک لہجے میں گرج برس رہے تھے۔ ان کے الفاظ یہ تھے۔

For more books visit www.4Urdu.com

"(میں نے یہ لغو بات پڑھ لی ہیں۔ تم لوگ اس خیال میں ہو جیسے میں امریکہ صرف مکئی کھیلیں اور آئس کریم کھانے جا رہا ہوں۔ نہیں جناب' نہیں جناب۔ میں ملک کے لیے کوئی بہتری کرنے کی کوشش میں ہوں۔ آخر تم لوگوں کو یہ جسارت ہی کیسے ہوئی کہ میرے وزیروں کے متفقہ فیصلوں کو رد کرنے کا سوچو؟ نہیں جناب۔ اس طرح کام نہیں چل سکتا۔")

اتنا کہہ کر صدر ایوب نے دھماکے کے ساتھ اپنا ریسیور ٹیلیفون پر دے مارا اور مجھے کچھ کہنے کا موقع تک نہ ملا۔ میں نے فوراً فون کر کے دہلوی صاحب اور نذیر احمد صاحب کو اس صورت حال کی خبر دی۔ دہلوی صاحب تو کسی قدر پریشان ہوئے۔ لیکن نذیر احمد نے زور کا قہقہہ لگایا اور کہا۔ تم فائرنگ لائن میں بیٹھے ہو۔ اب بھگتو۔ لیکن خبردار ڈرنا مت' بس ڈٹے رہو۔"

اس روز دن کے ڈیڑھ بجے کے قریب صدر ایوب اپنے دفتر سے اٹھے۔ ان کا معمول تھا کہ برآمدے سے گزرتے ہوئے وہ اکثر میرے کمرے کی کھڑکی کے سامنے لمحہ دو لمحہ رک کر سلام دعا کر لیا کرتے تھے اور اگر ان کے ذہن میں یا میرے پاس کوئی ضروری کام ہوتا تو اس کے متعلق چند باتیں بھی کر لیتے تھے۔ لیکن آج وہ اس قدر تاؤ میں تھے کہ میری کھڑکی کی جانب آنکھ تک نہ اٹھائی اور ناک کی سیدھ میں آگے بڑھ گئے۔ دوسری صبح اپنے دفتر کی طرف جاتے ہوئے بھی انہوں نے یہی رویہ روا رکھا اور دوپہر کے وقت بھی ایسا ہی کیا۔ ان دو دنوں کے دوران انہوں نے میرے ساتھ نہ کوئی بات کی اور نہ ہی ٹیلیفون کیا۔ ان کے اس برتاؤ نے میرے دل میں بھی کسی قدر آزردگی پیدا کی۔ قومی سطح کے کسی اہم سرکاری معاملے پر اپنی آزادانہ رائے کا اظہار کرنا ہمارا فرض تھا۔ اسے مان لینا یا رد کر دینا صدر مملکت کا اپنا اختیار تھا۔ اگر ہمارے فرض کی ادائیگی ان کو اس قدر گراں گزری تھی تو وہ ہم تینوں کو ہمارے عہدوں سے تبدیل کر سکتے تھے یا بیک جنبش قلم ہمیں ریٹائر یا موقوف بھی کر سکتے تھے لیکن بگڑے ہوئے بچے یا بدمزاج ساس کی طرح اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر روٹھ بیٹھنا ان کی

For more books visit www.4Urdu.com

شان کے شایاں نہ تھا ان کے اس طرز عمل کے جواب میں تیسرے دن میں نے بھی ایک ایسی ہی طفلانہ حرکت کی۔ میں نے برآمدے کی طرف کھلنے والی کھڑکی اندر سے بند کر کے کنڈی چڑھا لی۔ غالباً میری اس حرکت پر ان کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور چوتھی صبح وہ اپنے دفتر میں جانے کی بجائے میرے کمرے میں آ گئے۔ اندر آ کر انہوں نے نیم سنجیدگی سے کہا۔ "تازہ ہوا صحت کے لیے مفید ہے۔ کمرے کی کھڑکی کھول کر بیٹھنا چاہیے۔"

پھر وہ اپنے پرانے معمول کے مطابق میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر مجھے بتایا کہ کافی سوچ بچار کے بعد امریکہ کے دورے کے متعلق اب وہ ہمارے ہمخیال ہو گئے ہیں۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے انہوں نے ان موضوعات اور نکات کا جائزہ لیا جو انہیں امریکہ میں جا کر اٹھانے چاہئیں۔ امریکی کانگرس کے سامنے اپنی تقریر کا انہیں خاص خیال تھا۔ وہاں پر وہ لکھی ہوئی تقریر پڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ فی البدیہہ خطاب کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھے چند مختصر سے نوٹ تیار کرنے کی ہدایات دیں۔ آخر میں انہوں نے حکم دیا کہ ان کا دورہ شروع ہونے سے چند روز قبل میں دہلوی صاحب اور نذیر احمد صاحب کے ہمراہ واشنگٹن پہنچ جاؤں۔ اور ہم لوگ اپنے سفیر مسٹر عزیز احمد کے ساتھ مل جل کر اس دورے کے نئے رخ کو بعنوان شائستہ نبھانے کی کوشش کریں۔

صدر ایوب کا دورہ شروع ہونے سے چار پانچ روز قبل ہم تینوں واشنگٹن پہنچ گئے۔ وہاں پر مسٹر عزیز احمد نے ہمیں بتایا کہ پریذیڈنٹ کینڈی بذات خود تو نہایت ذہین' روشن خیال اور حقیقت شناس انسان ہیں۔ لیکن ہاورڈ یونیورسٹی کے دانشوروں کے ایک ایسے گروہ نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے جو جذباتی طور پر پاکستان کے مقابلے میں بھارت کی جانب زیادہ مائل ہیں۔ اس لیے صدر ایوب کو اپنے دورے میں ہر مقام پر پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہو گا۔

واشنگٹن میں صدر ایوب کی آمد سے چند منٹ پہلے پریذیڈنٹ کینڈی بھی صدارتی ہیلی کاپٹر

For more books visit www.4Urdu.com

کے ذریعے ہوائی اڈے پر آ گئے۔ مسٹر عزیز احمد نے ان کے ساتھ ہم تینوں کا تعارف کرایا تو وہ مسکرائے اور بولے "میں مان گیا۔ صدر ایوب واقعی ایک عملی فوجی کمانڈر بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے وفد کا ہراول دستہ تو پہلے ہی سے یہاں بھیج رکھا ہے!

صدر کینڈی اور مسٹر عزیز احمد نے جو سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھے وہ ایک ہی جیسے کپڑے سے بنے ہوئے تھے۔ جونہی مسٹر کینڈی کے مشاہدے میں یہ بات آئی انہوں نے فوراً کہا۔ مسٹر ایمبیسڈر۔ کیا یہ نیک فال نہیں کہ ہم دونوں نے ایک ہی سا لباس پہنا ہوا ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ہمارے مذاکرات میں بھی ایسی ہی ہمخیالی قائم رہے گی۔"

صدر کینڈی جوانی' رعنائی' خوش گفتاری اور ذہانت کا سیماب صفت پیکر تھے۔ کبھی کبھی ان کا انداز ایک ایسے الھڑ نوجوان کے ساتھ مشابہت کھانے لگتا تھا جو ابھی ابھی اپنے کالج کی کلاس میں کسی قسم کی شرارت کر کے بھاگا ہو۔ ان کی نیلی نیلی آنکھوں میں بلا کی تیزی اور گہرائی تھی' وزیروں' مشیروں اور سفیروں کے ہجوم کے درمیان بھی وہ یوں نظر آتے تھے جیسے اکیلے اور تنہا ہوں۔ صدر ایوب کے ساتھ دوبار امریکہ کے دوروں میں مجھے صدر کینڈی کو کئی بار کافی نزدیک سے دیکھنے کا موقع میسر آیا۔ ہر بار مجھے یہی احساس ہوا کہ ان کی دلنواز مسکراہٹ اور چلبلاہٹ کے پردے میں ایک بے نام سا حزن و ملال بھی پوشیدہ ہے۔ صدر ایوب نے اپنے پہلے دورہ امریکہ کو نہایت خوش اسلوبی' خودداری اور خود اعتمادی کے ساتھ نبھایا۔ مسٹر اور مسز کینڈی نے بھی دل کھول کر ان کی خاطر و مدارات کی مذاکرات بھی اچھے رہے۔ اس زمانے میں یہ افواہ زوروں پر تھی کہ امریکی حکومت Mutual Security Act میں ایسی ترامیم لا رہی ہے' جن سے غیر جانبدار ممالک کو بھی معاشی' اور فوجی امداد فراہم کرنا ممکن ہو جائے گا۔ صدر ایوب نے کہا کہ اگرچہ بھارت روس سے باضابطہ ہر قسم کی فوجی اور معاشی امداد حاصل کرتا رہا ہے لیکن امریکہ کی نظر میں وہ ہمیشہ ایک غیر جانبدار ملک ہی رہا ہے۔ اب اگر قانون میں مجوزہ ترمیم کے بعد بھارت بھی امریکن فوجی امداد کا قانونی طور پر حقدار بن

For more books visit www.4Urdu.com

گیا تو پاکستان جیسا آپ کا پرانا دوست کہاں جائے گا؟

صدر کینڈی نے دو ٹوک الفاظ میں برملا یہ یقین دلایا کہ امریکہ بلاشبہ پاکستان کی دوستی کی قدر کرتا ہے۔ صدر ایوب خاطر جمع رکھیں کہ ہندوستان کو کسی قسم کی فوجی امداد فراہم کرنے سے پہلے امریکہ پاکستان کو اعتماد میں لے کر اس سے ضرور مشورہ کرے گا۔

URDU4U.COM

لیکن حیف صد حیف کہ صدر کینڈی اپنا یہ وعدہ وفا نہ کر سکے۔ جونہی بھارت اور چین کے درمیان سرحدی جھڑپ رونما ہوئی' امریکہ کی بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ چینی فوج سے بری طرح شکست کھا کر بھارتی فوج سر پر پاؤں رکھ کر میدان جنگ سے بھاگی تو امریکہ نے بھی فوراً اپنی خیر سگالی کا ڈول ڈالا اور پاکستان کو اعتماد میں لیے بغیر برطانیہ کے ساتھ مل کر ہندوستان کو بے دریغ ہر قسم کی فوجی امداد دینا شروع کر دی۔ واشنگٹن میں ہمارے سفیر نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن اس کے احتجاج پر کسی نے کان تک نہ دھرے۔ سب لوگ یہی کہہ کر ٹالتے رہے کہ ہندوستان کو جو اسلحہ دیا جا رہا ہے وہ صرف چین کے خلاف استعمال ہو گا' پاکستان کے خلاف استعمال ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن پاکستان میں ہم بھارت کے اصلی عزائم سے خوب واقف تھے' ہم پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ دشمنی کی ترجیحات میں بھارت کے نزدیک اس کا سب سے بڑا دشمن پاکستان ہے' چین نہیں۔ اس لیے جلدی یا بدیر یہ اسلحہ پاکستان ہی کے خلاف استعمال ہو گا جیسا کہ حقیقت میں ہوا' پہلے ۱۹۶۵ء میں۔ بعدازاں ۱۹۷۱ء میں۔ روز اول ہی سے پاکستان نے امریکہ کے ساتھ اپنی وفاداری اور تابعداری نبھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ہمارے پہلے وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں نے روس کا دعوت نامہ پس پشت ڈال کر امریکہ کا دورہ قبول کر لیا۔ گورنر جنرل غلام محمد اور صدر اسکندر مرزا کے زمانے میں امریکی مشیر ہمارے کاروبار حکومت پر ٹڈی دل کی طرح چھائے رہے۔ کمانڈر انچیف کی حیثیت سے صدر ایوب نے ہماری افواج کو اس طرز پر منظم اور مسلح

For more books visit www.4Urdu.com

کیا کہ ہماری دفاعی شہ رگ ہمیشہ کے لیے امریکہ کی مٹھی میں دب کر رہ گئی۔ روس اور عرب ممالک کی ناراضگی مول لے کر ہم بغداد پکیٹ عرف سینٹو کے رکن بنے تاکہ امریکہ کی خوشنودی ہمارے شامل حال رہے۔ سیٹو میں شامل ہو کر ہم نے چین کی ناکہ بندی میں حصہ لیا تاکہ امریکہ کی خیر سگالی ہمارے ساتھ قائم و دائم رہے۔ لیکن ہماری جانب سے یہ صرف یکطرفہ ٹریفک تھی۔ دوسری جانب سے ہمیں گھر کی مرغی دال برابر سمجھ کر حسب ضرورت پیٹ بھرنے کے لیے تھوڑا بہت دانا دنکا ڈال دیا جاتا تھا ورنہ امریکہ کی اصلی کوشش اور خواہش ہندوستان کو رام کرنے کی تھی جو روس کی گود میں بیٹھ کر امریکہ کو ٹھینگا بھی دکھاتا تھا' اور اپنی نام نہاد غیر جانبداری کا گھونگھٹ نکال کر ۱۹۵۱ء سے ایک Mutual Defence Assistant Agreement کے تحت چپکے چپکے امریکن فوجی امداد بھی مسلسل حاصل کر رہا تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ پاکستان کے وجود میں آتے ہی امریکہ کے چند عناصر نے اس کی مخالفت پر کمر باندھ لی تھی۔ بٹوارہ تو ہندوستان کا ہوا تھا' لیکن اس کا چرکہ امریکہ کے کچھ یہودی اور یہودی نواز طبقوں نے بری طرح محسوس کیا تھا۔ ۱۹۵۰ء کی بات ہے کہ ڈھاکہ میں ایک امریکن کاروباری فرم کا ایک نمائندہ کچھ عرصہ سے مقیم تھا۔ بظاہر اس کا نام (Mr Crook) تھا لیکن باطن میں بھی وہ اسم بمسمہ ثابت ہوا۔ کیونکہ رفتہ رفتہ یہ راز کھلا کہ وہ مشرقی پاکستان میں علیحدگی کا بیج بونے میں ہمہ تن مصروف تھا۔ پاکستان کی سالمیت کے خلاف اس کی کارروائیوں کا علم ہوتے ہی حکومت نے اسے بلا تاخیر ناپسندیدہ شخص قرار دے کر ملک سے نکال باہر کیا۔

چند قابل قدر مستثنیات کو چھوڑ کر پاکستان میں وقتہ فوقتہ متعین ہونے والے امریکی سفیر اور سفارت کار بھی بعض اوقات ایک مشہور کتاب "The Ugly Amerecan" کے چلتے پھرتے کردار نظر آتے تھے۔ ایک سفیر صاحب ایسے تھے جو صدر مملکت کے ساتھ اپنی ملاقات کا وقت پہلے سے مقرر کروانا اپنی ہتک عزت تصور فرماتے تھے۔ ان کا جب جی

For more books visit www.4Urdu.com

چاہتا تھا وہ اپنی کار میں بیٹھ کر اچانک ایوان صدارت میں وارد ہو جاتے تھے۔ اور جناب صدر ہزار کام چھوڑ کر انہیں خوش آمدید کہنے پر مجبور تھے۔

URDU4U.COM

ایک بار کراچی کے ایوان صدر میں رات کے وقت کوئی لمبی چوڑی تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ گرمی کا موسم تھا۔ ڈنر کے بعد باہر لان میں صدر کے باڈی گارڈ کا بینڈ اپنے جوہر دکھانے لگا۔ مہمان چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بیٹھ کر خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ ایک ایسا ہی گروپ چند امریکی سفارت کاروں اور عالمی بینک کے کارکنوں پر مشتمل شراب ناب سے شغل فرما رہا تھا۔ دو تین پاکستانی افسر بھی انکی خاطر تواضع میں لگے ہوئے تھے۔ شامت اعمال سے ایک پاکستانی دوسرے پاکستانی کے ساتھ اردو زبان میں چند فقرے بول بیٹھا۔ اس پر ایک امریکی سفارت کا پارہ چڑھ گیا' اور اس نے دونوں کو چیخ کر ڈانٹا (Shut up No urdu here) (بکواس بند کرو' یہاں اردو نہیں چلے گے) اس کے علاوہ وہ بلند آواز میں پاکستانیوں کے مجلسی آداب و رسوم میں کیڑے نکالنے بھی بیٹھ گئے۔ بیچ بچاؤ کرنے کے لیے میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو اس نے ڈانٹ کر مجھے بھی ایک طرف دھکیل دیا۔ اس کی اس بدتمیزی پر مجھے غصہ آ گیا' اور میں نے اس کے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اردو کے چند فقروں نے اس نازک بدن کے کس مقام پر شدید ضرب لگائی ہے کہ وہ خواہ مخواہ اس قدر بلبلا رہا ہے۔"

یہ سن کر ایک اور امریکی اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا نام غالباً Bell Mr تھا۔ اور وہ کسی مالیاتی یا معاشیاتی ادارے کے ساتھ وابستہ تھا اس نے نہایت دھیمے انداز سے کہا۔ "اس کی وجہ میں سمجھاتا ہوں۔ اردو نہ کوئی مجلسی زبان ہے اور نہ ہی تمدنی زبان ہے۔ اس زبان میں Public کے لیے اپنا کوئی لفظ نہیں کیونکہ آپ لوگ پبلک کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ اس زبان میں Public Servant کے لیے افسر کے علاوہ اپنی کوئی اصطلاح نہیں۔ کیونکہ یہاں پر Public service کا تصور سرے سے مفقود ہے۔" وہ کچھ دیر اسی طرح بے تکان بولتا رہا۔ اس کے امریکی ساتھی تو خیر اسے داد

For more books visit www.4Urdu.com

دے ہی رہے تھے لیکن ہماری نوکر شاہی کے چند کل پرزے بھی موقع واردات پر آ پہنچے اور بڑی خوشدلی سے اثبات میں سر ہلانے لگے۔

URDU4U.COM

صدر ایوب کے اقتدار کے آخری چند برسوں میں یہاں پر امریکہ کے جو سفیر متعین تھے ان کا اسم گرامی مسٹر بی ایچ اوہلرٹ (Mr B.H Oelhert Jr) تھا۔ یہ صاحب نسلاً یہودی تھے' اور کسی کوکا کولا بنانے والی کمپنی کے غالباً وائس پریذیڈنٹ تھے۔ وہ وضع قطع میں بے ڈول' چال ڈھال میں بے ہنگم' اخلاق و آداب میں اکھڑ اور سفارتی رکھ رکھاؤ اور شائستگی سے بڑی حد تک بے نیاز تھے۔ ایک روز راولپنڈی کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں کوئی استقبالیہ تھا' وہاں سے فارغ ہو کر ہم لوگ برآمدے میں کھڑے اپنی اپنی گاڑیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ مسٹر اوہلرٹ کی گاڑی پہلے آ گئی۔ انہوں نے اصرار کر کے اسلام آباد جانے کے لیے مجھے اپنی کار میں بٹھا لیا۔ جتنا عرصہ ہم مری روڈ سے گزرتے رہے۔ وہ پاکستانی سڑکوں پر ٹریفک اور پیدل چلنے والوں کے رنگ ڈھنگ پر طرح طرح کی پھبتیاں کستے رہے موٹروں' بسوں' رکشاؤں اور سکوٹروں کے ہجوم میں بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھٹکنے والے راہگیروں کو وہ تمسخر اور تکبر سے Bipeds (دو پایہ مخلوق) کے لقب سے نوازتے تھے۔ فیض آباد کے چوک پر پہنچ کر جب ہم شاہراہ اسلام آباد کی طرف مڑنے والے تھے تو مسٹر اوہلرٹ نے اچانک اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے اور اپنا سر گھٹنوں میں دے کر سیٹ پر جھک گئے۔ مجھے یہی خیال آیا کہ ان کی آنکھ میں کوئی مچھر یا مکھی گھس گئی ہے اور وہ بے چارے سخت تکلیف میں مبتلا ہیں۔

میں نے ازراہ ہمدردی ان سے دریافت کیا۔ "آپ خیریت سے تو ہیں؟"

مسٹر اوہلرٹ نے اپنی گاڑی ایک طرف رکوائی اور تیکھے لہجے میں بولے "میں بالکل خیریت سے نہیں۔ میں کس طرح خیریت سے ہو سکتا ہوں؟ وہ دیکھو۔" انہوں نے باہر کی طرف اشارہ کر کے کہا "وہ دیکھو آنکھوں کا خار' میں جتنی بار ادھر سے گزرتا ہوں' میری آنکھوں میں یہ کانٹا بری طرح کھٹکتا ہے۔"

میں نے باہر کی طرف نظر دوڑائی تو چوراہے میں ایک بڑا اشتہاری بورڈ آویزاں تھا۔ جس

For more books visit www.4Urdu.com

پر پی۔ آئی۔ اے کا ایک رنگین اشتہار دعوت نظارہ دے رہا تھا اس اشتہار میں درج تھا کہ پی آئی اے سے پرواز کیجیے اور چین دیکھیے!

URDU4U.COM

میں نے انہیں اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ یہ محض ایک ایئرلائن کا تجارتی اشتہار ہے۔ اسے اپنے اعصاب پر سوار کر کے سوہان روح بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس زمانے میں چین کے خلاف بغض اور دشمنی کا بھوت پوری امریکن قوم کے سر پر بری طرح سوار تھا۔ خاص طور پر اس معاملے میں مسٹر اوہلرٹ مریضانہ حد تک ذکی الحس تھے۔ اس لیے میری بات سن کر وہ خوش نہ ہوئے بلکہ کسی قدر برا منا کر گم سم بیٹھ گئے۔

چند روز بعد میں نے دیکھا کہ فیض آباد چوک سے چین والا بورڈ اٹھ گیا ہے اور اس کی جگہ پی آئی اے کا اشتہار بنکاک دیکھنے کی دعوت دے رہا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ تبدیلی محض تجارتی نکتہ نظر سے رونما ہوئی تھی یا اس معاملے میں مسٹر اوہلرٹ کے آشوب چشم کی کچھ رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی تھی۔

چین کے حوالے سے مجھے مسٹر اوہلرٹ کی نازک مزاجی کا ایک اور تجربہ بھی ہوا۔ ایک بار راولپنڈی کے گورنمنٹ گزلز کالج میں کوئی امریکی پروفیسر تقریر کرنے آیا ہوا تھا۔ پرنسپل صاحبہ نے صدارت کرنے کے لیے مجھے مدعو کر لیا۔ اپنی تقریر کے دوران پروفیسر صاحب نے ایک عجیب و غریب طرز بیان اور پیرائی استدلال اپنایا۔ انہوں نے یہ الزام لگایا کہ ترقی پذیر ممالک امریکی امداد ہاتھ پھیلا پھیلا کر مانگتے تو ضرور ہیں لیکن اسے حاصل کرنے کے بعد بھی وہ بدستور فرسودہ اقدار ثقافت کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں۔ یہ سراسر ناشکری کی علامت ہے کیونکہ امریکی امداد کا مقصد صرف ڈالر اور اسلحہ ہی تقسیم کرنا نہیں' بلکہ دراصل ہمارا بنیادی مقصد امریکی اقدار' امریکی ثقافت' امریکی طرز حیات اور امریکی رسم و رواج کو بھی ساری دنیا میں پھیلانا اور فروغ دینا ہے۔ خاص کر تعلیم کے شعبہ میں پروفیسر صاحب نے زور دے کر کہا جو طلبا وظائف پر امریکن یونیورسٹیوں

For more books visit www.4Urdu.com

میں جا کر پڑھتے ہیں اور صرف ڈگریاں اور ڈپلومے لے کر واپس آ جاتے ہیں وہ ہمارا وقت اور پیسہ ضائع کرتے ہیں' ہمیں صرف ایسے طلباء اور طالبات کو وظیفوں کا مستحق سمجھنا چاہیے جو ڈگریوں کے علاوہ امریکن اقدار و ثقافت' امریکن اخلاق و عادات' امریکن بود و باش کے نقوش بھی اپنے ہمراہ واپس لائیں اور انہیں اپنے اپنے ممالک اپنے اپنے ماحول اور اپنے اپنے گھروں میں جاری و ساری کریں۔

ان لغویات کے جواب میں میں نے پروفیسر صاحب کو آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کہ اگر امریکی امداد کو امریکی اقدار اور کلچر اپنانے کے ساتھ مشروط کر دیا گیا تو کئی غریب اور خود دار ممالک ایسی امداد کو بے نیازی سے ٹھکرا دیں گے۔ جن شرائط پر پروفیسر صاحب ہمارے طلبا اور طالبات کو تعلیمی وظائف دینا چاہتے ہیں' وہ ہمیں قابل قبول نہیں اور ہم ایسے وظائف کو بھی دور ہی سے سلام کرتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ہمیں علوم حاصل کرنے کے لیے دوسرے ممالک کی طرف رخ موڑنا ہو گا۔ یوں بھی ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ علم حاصل کرو' خواہ تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔

میری تقریر کے کچھ حصے ہمارے کئی اخبارات نے بڑے نمایاں طور پر شائع کیے۔ چین والا فرمان رسول پڑھ کر امریکی سفیر مسٹر اوہلرٹ سیخ پا ہو گیا۔ ان کا پیغام آیا کہ فوری طور پر میرے دفتر میں آ کر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں ان کے عزائم بھانپ گیا۔ اور میں نے وزارت خارجہ سے درخواست کی کہ اس ملاقات کی روئداد قلم بند کرنے کے لیے وہ اپنا ایک افسر بھی میرے دفتر میں بھیج دیں۔ انہوں نے مسٹر ریاض پراچہ کو اس کام پر مامور کر دیا' جو اس وقت وزارت میں غالباً جائنٹ سیکرٹری تھے اور بعد میں سیکرٹری امور خارجہ کے علاوہ کابل' دہلی اور ہالینڈ میں سفیر کے عہدوں پر بھی فائز رہے۔

مسٹر اوہلرٹ بھی سفارت خانے کا ایک کونسلر اپنے ہمراہ لائے تھے۔ وہ شدید اعصابی تناؤ میں مبتلا نظر آتے تھے۔ میرے کمرے میں داخل ہو کر وہ بیٹھنے کی بجائے دیوانہ وار ادھر ادھر گھومتے رہے۔ پھر اچانک رک کر بولے۔ "کیا مجھے کچھ کافی مل سکتی ہے؟"

For more books visit www.4Urdu.com

میں نے انہیں یقین دلایا کہ کافی ابھی حاضر ہو جائے گی۔
بے چینی کے عالم میں انہوں نے لمبے لمبے گھونٹ بھر کر کافی کی پیالی ختم کی اور پھر
URDU4U.COM
بیس پچیس منٹ تک وہ نہایت تلخ انداز میں میری تقریر کے بخیے ادھیڑتے رہے۔ انہوں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا کہ اگر آپ امریکہ امداد سے منہ موڑ کر چین کے ساتھ اپنا تعلیمی رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں تو آپ ہمیں لکھ کر بھیج دیجیے پاکستان کو امداد دیئے بغیر امریکہ بحر اوقیانوس میں غرق نہیں ہو جائے گا۔
میں جانتا تھا کہ سفری صاحب اس قسم کا تیز و تند اور اشتعال انگیز رویہ جان بوجھ کر اختیار کر رہے ہیں تاکہ میں بھی برانگیختہ ہو کر ترکی بہ ترکی جواب دینے پر اتر آؤں۔ اور اس طرح یہ واقعہ ایک Diplomatic Scene (سفارتی حادثہ) بن کر حکومت اور صدر ایوب کے لیے مفت کا درد سر بن جائے۔ اس لیے میں نے صبر و تحمل سے کام لیا اور ان کی تلخی و تندی نظر انداز کر کے ایک عام اور نارمل انداز کی گفتگو شروع کر دی۔ اپنا وار خالی جاتا دیکھ کر وہ بڑے مایوس ہوئے۔ کافی کی دوسری پیالی پی کر جب میں انہیں ان کی کار تک چھوڑنے جا رہا تھا تو راستے میں انہوں نے کسی قدر معذرتانہ انداز میں کہا۔ "دراصل میں پیشہ ور سفارتکار (Professional diplomat) نہیں ہوں۔ اس لیے میری گفتگو میں اگر کوئی بات آپ کو بری لگی ہو تو اسے نظر انداز کر دیں۔"
"یور ایکسیلینسی" میں نے نہایت ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ "یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ امریکہ جیسی عظیم سپر پاور پاکستان جیسے مخلص حلیف کو اپنے پیشہ ور سفارتی ماہرین سے نوازنا ضروری نہیں سمجھتی۔"
میرے اس جملے کی چبھن امریکی سفیر اور کونسلر دونوں نے صریحاً محسوس کی اور کسی قدر جھینپ کر زیر لب منمناتے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔
جنوری ۱۹۶۸ء کے آخری ایام میں اچانک صدر ایوب پر دل کا شدید دورا پڑا۔ کمانڈر انچیف

For more books visit www.4Urdu.com

جنرل یحییٰ اور وزیر دفاع ایڈمرل اے۔ آر۔ خان نے مل کر فوراً ایوان صدر کو اپنے کنٹرول میں لے لیا اور صدر ایوب دس بارہ روز تک عملاً صرف ان دونوں کی تحویل میں رہے۔ حکومت کے باقی تمام اراکین سے ان کا رابطہ مکمل طور پر کٹ چکا تھا۔ ان ایام میں بھی مسٹر اوہلرٹ کا صبح و شام کا واسطہ اگر کسی سے تھا تو جنرل یحییٰ سے تھا۔

مارچ ۱۹۶۹ء میں جب صدر ایوب کے خلاف ملک گیر ایجی ٹیشن اپنے عروج پر تھی' یکایک یہ خبر نکلی کہ انیس تاریخ کو امریکی سفیر مسٹر اوہلرٹ ایک اہم مشورہ کے لیے واشنگٹن روانہ ہو گئے ہیں' کئی لوگوں نے اندازہ لگایا کہ وہ یحییٰ خان کو اقتدار منتقل کرنے کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کروانے واشنگٹن گئے ہیں۔ واللہ اعلم باصواب۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی واپسی کے ایک یا دو روز بعد ۲۵ مارچ کو صدر ایوب مستعفی ہو گئے' اور جنرل یحییٰ نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر کی گدی سنبھال لی۔

۱۹۶۷ء میں جب صدر ایوب کی خود نوشت سوانح عمری شائع ہوئی تو انہوں نے غالباً امریکہ کے حوالے سے اس کتاب کا نام (Friends Not Masters) رکھا تھا۔ اردو ترجمے کا عنوان تھا۔ "جس رزق سے آتی ہوں پرواز میں کوتاہی۔" اگر یہی کتاب ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کے بعد لکھی جاتی تو امریکہ کے حوالے سے صدر ایوب اس کا یہ عنوان منتخب کرنے میں حق بجانب ہوتے:

"نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی۔"

○ چین

اگرچہ پاکستان ۱۹۵۴ء ہی سے سیٹو (SEATO) کا ممبر ہو کر چین کی ناکہ بندی میں شامل تھا' لیکن عوامی جمہوریہ چین کی قیادت نے کبھی ہمارے اس اقدام کو بنائے فساد اور متنازع فیہ نہیں بنایا تھا۔ اس کی وجہ ان کی عالی حوصلگی اور حسن تدبر ہی نہیں بلکہ ان کی حقیقت شناسی بھی تھی۔ کیونکہ غالباً انہیں ہماری اندرونی اور بیرونی مجبوریوں اور

For more books visit www.4Urdu.com

معذوریوں کا بھی ضرور احساس تھا۔

روس کے ساتھ تو چین کا نظریاتی بھائی چارا شروع ہی سے تھا۔ لیکن ایک زمانے میں "ہندی چینی بھائی بھائی" کا بلند بانگ نعرہ بھی برصغیر کے کونے کونے میں گونج رہا تھا۔

URDU4U.COM

رفتہ رفتہ حالات نے کروٹ لی۔ روس اور چین میں شدید نظریاتی اختلافات پیدا ہو گئے۔ ان کا باہمی اقتصادی بندھن ٹوٹ گیا۔ روس نے چین میں ترقیاتی منصوبوں کی بساط لپیٹ کر ہر قسم کے تعاون اور امداد سے ہاتھ کھینچ لیا' یہاں تک کہ جو فیکٹری یا منصوبہ جس منزل میں تھا' وہیں پر ادھورا چھوڑ کر ان کے بلیو پرنٹ تک اپنے ساتھ واپس لے گئے۔

ہندوستان نے ایشیا کی قیادت کا تاج اپنے سر پر سجانے کے لیے چین کے ساتھ رقابت اور مسابقت کا راستہ اختیار کیا تو دونوں کے درمیان قدرتی طور پر ٹھن گئی اور باہمی سرحدی مناقشات اور اختلافات بھی سر اٹھانے لگے۔ ایسے معاملات میں بھارت کی ہٹ دھرمی اور اپنی من پسندی کو اجاگر کرنے کے لیے چین نے برما اور نیپال جیسے چھوٹے ملکوں کے ساتھ نہایت معقول سرحدی معاہدے طے کر کے اپنی فراخدلی کا ثبوت دیا۔ یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ ہماری وزارت خارجہ نے بھی اس موقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا' اور چین اور پاکستان کے درمیان ایک سرحدی معاہدہ طے کرنے کے لیے تفصیلات طے کر لیں۔ شروع میں تو صدر ایوب کسی قدر حیص بیص' شش و پنج اور طرح طرح کی ہچکچاہٹوں میں ڈانواں ڈول رہے۔ لیکن ۱۹۶۲ء کی بھارت اور چین جنگ کے رنگ نے ان کا حوصلہ بڑھایا اور فروری ۱۹۶۳ء کے اواخر میں انہوں نے ایک پاکستانی وفد کو سرحدی معاہدہ طے کرنے کے لیے چین جانے کی اجازت دے دی۔

اس وفد کے قائد ہمارے وزیر خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ حسن اتفاق سے مجھے بھی اس وفد میں شامل کر دیا گیا تھا۔ دوسرے اراکین وزارت خارجہ کے ایک سنیئر افسر مسٹر خراس' پاکستان کے سرویئر جنرل اور پکینگ میں ہمارے سفیر میجر جنرل رضا تھے۔ صدر ایوب کو تشویش تھی کہ سرحدی معاہدہ پر دستخط ہونے سے پہلے اگر ہمارے وفد کی

For more books visit www.4Urdu.com

خبر عام ہو گئی تو ہماری راہ میں روڑے اٹکانے کی غرض سے ان پر طرح طرح کے دباؤ بڑھنا شروع ہو جائیں گے اور چین کے دشمن ممالک بھی ہمارے منصوبے کو سبوتاژ کرنے کے لیے مختلف قسم کی ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو جائیں گے چنانچہ فیصلہ ہوا کہ ہم نہایت خاموشی سے سفر کر کے پکینگ پہنچیں اور سرحدی معاہدہ پر دستخط ہونے سے قبل اس وفد کی کوئی خبر باہر نہ نکلنے پائے۔

ہمارے سرویئر جنرل صاحب تو الگ پکینگ کے لیے روانہ ہو گئے اور مسٹر خراس اور میں مسٹر بھٹو کے ساتھ کراچی سے ہانگ کانگ جانے کے لیے Lufthansa کے ایک ہوائی جہاز میں سوار ہو گئے۔ یہ جہاز گھنٹہ بھر کے لیے کلکتہ کے ہوائی اڈے پر بھی رکا۔ وہاں پر ہمارے کونسل جنرل مسٹر ایم۔ اے علوی ہمیں ملنے اندر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے طور پر کافی کوشش کی کہ ہم ٹرانزٹ لاؤنج میں چند خالی کرسیوں پر بیٹھنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اول تو لاؤنج میں ہجوم زیادہ تھا۔ دوسرے اگر ہم کسی خالی کرسی کی طرف بڑھتے بھی تھے تو دوسرے مسافر لپک کر اس پر قبضہ جما لیتے تھے۔ آخر مجبور ہر کر علوی صاحب ہمیں ریسٹوران میں لے گئے جہاں چائے کا آرڈر دے کر ہم پون گھنٹہ کے قریب بیٹھے رہے۔

ہانگ کانگ میں سارا دن بھٹو صاحب مجھے اپنے ہمراہ لے کر نوادرات کی دکانوں اور بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹورز میں گھومتے رہے۔ ایک فیشن ایبل سٹور میں انہوں نے اپنے لیے پانچ سوٹ سلوانے کا آرڈر دیا۔ جو چین سے ان کی واپسی پر تیار ملیں گے۔ اصرار کر کے انہوں نے پانچ سوٹوں کا آرڈر میرے لیے بھی دے دیا میں نے بہت احتجاج کیا کہ یہ سوٹ مہنگے ہیں اور مجھے ان کی ضرورت بھی نہیں لیکن وہ نہ مانے اور واپسی پر میرے سوٹوں کی قیمت بھی اپنی جیب سے ادا کی۔ ان میں سے ایک آدھ سوٹ آج تک بھی میرے پاس موجود ہے۔

چین میں ہمارے وفد کی نہایت شاندار پذیرائی ہوئی۔ چینی وزیر خارجہ مارشل چن ژی بڑے زندہ دل اور بذلہ سنج انسان تھے۔ ہمارے پروگرام کی سب تفصیلات وہ اپنی ذاتی نگرانی

For more books visit www.4Urdu.com

میں طے کرتے۔ ۲ مارچ ۱۹۶۳ء کو ایک پروقار تقریب میں انہوں نے مسٹر بھٹو کے ساتھ پاک چین سرحدی معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ دستخط کرتے وقت ان دونوں کی کرسیوں کے پیچھے جو لوگ قطار بنا کر کھڑے ہوئے ان میں چین کے صدر لیوشاؤچی اور وزیراعظم چو این لائی بھی شامل تھے۔

وزیراعظم چو این لائی تحمل' تدبر' فراست اور ذہانت کا ایک بے مثال پیکر تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکے سے تبسم کی ایک مدھم سی لہر ہر وقت یوں کھیلتی رہتی تھی کہ کسی کو یہ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ مسکرا چکے ہیں یا مسکرانے والے ہیں ان کی تیز نگاہی ماحول میں پیوست ہو کر گرد و پیش کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتی تھی۔ اور ان کی شگفتہ بیانی عالمی سیاست کے تجزیے کو فصاحت و بلاغت کے سانچے میں ڈھال کر عجیب و غریب جادو جگاتی تھی' مشاہیر عالم میں ایسی غیر معمولی خصوصیات کا اور کوئی رہنما میری نظر سے نہیں گزرا۔

ایک روز وزیر اعظم چو این لائی نے بھٹو صاحب کے ساتھ مذاکرات شروع کئے تو وہ تقریباً سارا دن بولتے رہے۔ پانچ ساڑھے پانچ گھنٹوں میں انہوں نے سیاسیات عالم کا انتہائی گہرا اور بھرپور تجزیہ کیا۔ یہ تجزیہ اور تبصرہ وہ زبانی کرتے رہے' اور ایک بات بھی نہ تو انہوں نے کسی فائل یا یادداشت کی طرف رجوع کیا' نہ اپنی کوئی بات دہرائی اور نہ ہی کسی مقام پر رکے یا ہچکچائے۔ ان کے دلائل ٹھوس حقائق و شواہد پر مبنی تھے اور ان کا انداز بیان جذبات' مروضات اور داخلی آرزو مندی کی ملاوٹ سے خالی تھا۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ اب وہ اپنے تجزیے کا خلاصہ پیش کر کے یہ گفتگو ختم کر رہے ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنے تجزیئے کا لب لباب اسی ترتیب سے سمیٹ کر بیان کر دیا جس ترتیب سے انہوں نے صبح سے شام تک اسے وضاحت سے بیان کیا تھا۔ انسانی دماغ کو ایک خود کار مشین اور کمپیوٹر کی مانند اس طرح کام کرتے ہوئے میں نے اور کہیں نہیں دیکھا۔

For more books visit www.4Urdu.com

وزیراعظم چو این لائی کی گفتگو کو مسٹر خراس اور میں قلم بند کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یوں تو وہ صرف چینی زبان بولتے تھے' لیکن یقیناً انہیں انگریزی زبان پر بھی ضرور عبور حاصل ہو گا۔ ان کا ترجمان جب ان کی گفتگو کا انگریزی میں ترجمہ کرتا تھا' تو کئی بار مسٹر چو این لائی اسے ٹوک کر اس کے ترجمہ کی اصلاح بھی کر دیتے تھے۔

جب مسٹر چو این لائی واقعات عالم پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ایک چینی لڑکی وقتہ فوقتہ ہمیں چینی چائے کے تا نہ مگ تقسیم کرتی رہتی تھی۔ یہ ابلتا ہوا گرم پانی تھا جس میں چائے کی ایک یا دو پتیاں تیر رہی ہوتی تھیں۔ اس میں دودھ شکر ملانے کا رواج نہ تھا۔ چائے ڈھانپنے کے لیے ہر مگ کا اپنا خوبصورت سا ڈھکن بھی ہوتا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ وزیراعظم چو این لائی روانی سے بولتے بولتے کسی قدر ٹھٹھک جاتے ہیں اور ان کی نگاہیں بار بار میری جانب اٹھ رہی ہیں' مجھے خیال آیا کہ شاید میرے بیٹھنے کے انداز میں کوئی کجی یا قباحت پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے فوراً پینترا بدل کر پہلو تبدیل کر لیا لیکن اس کے باوجود مسٹر چو این لائی کی نظریں بدستور میری طرف اٹھتی رہیں۔ اس پر پریشان ہو کر میں کسی قدر جھینپا تو انہوں نے چائے تقسیم کرنے والی لڑکی کو بلا کر کچھ کہا۔ وہ میرا مگ اٹھا کر ان کے پاس لے گئی مسٹر چو این لائی نے مگ کا ڈھکن اٹھا کر اسے دکھایا کہ یہ چھوٹا ہے اور اس مگ پر اچھی طرح نہیں جمتا۔ لڑکی کا چہرہ عرق ندامت سے شرابور ہو گیا۔ اور وہ جا کر میرے لیے چائے کا ایک اور مگ لے آئی۔ اس کے بعد مسٹر چو این لائی سکون سے بیٹھ گئے اور اپنے تبصرے میں بدستور مصروف ہو گئے۔ ایک نہایت سنجیدہ تجزیے کے دوران ایک انتہائی کثیر المشاغل شخص کے ذہن کا اس قدر باریک تفصیل کی طرف منتقل ہونا میرے لیے بے حد حیرت ناک تھا۔

ایک پڑھی لکھی چینی خاتون مترجم کے فرائض سر انجام دینے کے لیے میرے ساتھ بھی مامور تھی۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ چائے تقسیم کرنے والی جس لڑکی کی غلطی پکڑی گئی ہے' کیا اسے اب کوئی سزا بھی ملے گی؟

For more books visit www.4Urdu.com

اس نے جواب دیا کہ چیئرمین ماوزی تنگ کا فرمان ہے کہ انسان غلطی کا پتلا ہے۔ ہر غلطی جرم کا درجہ نہیں رکھتی۔ اس لڑکی کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ معزز مہمانوں کے سامنے اس کی غفلت اور غلطی کا بھانڈا پھوٹ گیا۔

URDU4U.COM

ایک روز ہمارے وفد کو چیئرمین ماوزے تنگ کے ساتھ ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ وزیراعظم چو این لائی اور وزیر خارجہ مارشل چن ژی بھی وہاں موجود تھے۔ لیکن سارا عرصہ دونوں خاموشی سے مودبانہ بیٹھے رہے۔ اس وقت چیئرمین ماؤ کی عمر اسی برس کے لگ بھگ تھی لیکن ان کا گول مٹول چہرہ نیم خوابیدہ بچوں کی طرح پر سکون اور مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ مسٹر بھٹو کے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتے ہی چیئرمین ماؤ نے جو پہلا سوال کیا وہ یہ تھا۔ (Is East Pakistan Tranquil?) (کیا مشرقی پاکستان میں امن و امان ہے؟)

اس زمانے میں مشرق پاکستان میں بظاہر کسی خاص شورش کے آثار نمایاں نہ تھے۔ اس لیے چیئرمین ماؤ کا یہ سوال مجھے کسی قدر بے تک اور بے موقع و بے محل محسوس ہوا۔ لیکن اس کے بعد کئی دعوتوں اور استقبالیوں میں وزیراعظم چو این لائی اور وزیر خارجہ مارشل چن ژی کے علاوہ چند دوسرے چینی اکابرین بھی اپنے اپنے انداز سے ہمیں مشرقی پاکستان کے متعلق خاص طور پر باخبر اور چوکنا رہنے کی فرداً فرداً تاکید کرتے رہے۔

چین کے ساتھ ہمارے سرحدی معاہدے کی خبر عام ہوئی تو اس کے خلاف بھارت میں بڑا شور و غوغا ہوا' روس کو بھی یہ بات پسند نہ آئی اور امریکہ نے بھی ہمارے اس اقدام پر تیوریاں چڑھائیں۔ پاکستان میں امریکی سفارت خانہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ یہ معاہدہ طے کروانے میں میرا کوئی خاص ہاتھ تھا۔ اس لیے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق ان کے غم و غصے کا زیادہ نزلہ میری ذات پر ہی گرا۔ مارچ ۱۹۶۳ء ہی سے انہوں نے صدر ایوب کے ذہن میں میرے خلاف اپنے دباؤ کا پیچ ایسے انداز سے مروڑ مروڑ کر کسنا شروع کر دیا تھا کہ چھ سات ماہ کے اندر اندر مجھے پاکستان سے اٹھا کر ہالینڈ بھیج دیا گیا۔

For more books visit www.4Urdu.com

تین برس بعد جب میں ہالینڈ سے واپس آ کر وزارت تعلیم کا سیکرٹری مقرر ہوا تو ۱۹۶۶ء میں مجھے ایک بار پھر چین جانے کا موقع نصیب ہوا۔ اس بار میں چین کے ساتھ ایک ثقافتی معاہدہ اور پروگرام طے کرنے گیا تھا۔ اس دورے میں میری اہلیہ عفت بھی میرے ہمراہ تھی' ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے وہاں کے ہسپتالوں کا نظام دیکھنے کا شوق تھا چین پہنچتے ہی ایک چینی لیڈی ڈاکٹر اس کے ساتھ مامور ہو گئی اور عفت نے پیکینگ شنگھائی کے بڑے ہسپتالوں کے علاوہ دور دراز دیہاتوں میں پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے شفاخانوں اور ڈسپنسریوں کا بھی معائنہ کیا۔

Barefoot Doctors کے عملی رواج اور روایتی نظام کا بھی اس نے کسی قدر مطالعہ کیا۔ اور ایکوپنکچر طریقہ علاج کے چند حیرت انگیز نمونے بھی اس کے مشاہدے میں آئے۔ اس کا کہنا تھا کہ چین کا طبی نظام سستا اور موثر ہے' اور ہر کس و ناکس کو فوری طور پر با آسانی میسر ہے۔ ایک اور دلچسپ بات اس نے یہ بتائی کہ چین میں موٹے مرد اور موٹی عورتوں کی تعداد بے حد کم ہے۔ سب سے زیادہ موٹے بچے صرف نرسری سکولوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ جوں جوں وہ بڑے ہو کر اگلی جماعتوں میں جاتے ہیں' اسی طرح ان کے اجسام بھی سڈول ہو کر متناسب ہوتے جاتے ہیں۔

عفت کی میزبان چینی لیڈی ڈاکٹر نے وضاحت کی کہ انقلاب کے بعد سے چینی قوم نے جسمانی ورزش کو انتہائی پابندی سے اپنا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ چینی خوراک بھی صحت مند اور متوازن ہے۔ موٹاپے کا تعلق سستی' غلاظت اور جہالت پسندی سے ہے۔ اس لیے چینی معاشرہ میں ہر کوئی اس سے بچنے کی سعی کرتا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "چائے کے نام پر یہ جو آپ ہر وقت کھولتا ہوا گرم پانی پیتے رہتے ہیں' کیا موٹاپا روکنے میں اس کا بھی کوئی عمل دخل ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔" وہ ہنس کر بولی۔ "لیکن یہ ہمارا قومی مشروب ہے۔ اس میں بھی ضرور کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہو گی۔"

اس دورے کے وقت چین ماؤزی تنگ کے ثقافتی انقلاب کی زد میں آیا ہوا تھا۔ یہ ایک

For more books visit www.4Urdu.com

عجیب اور عظیم تجربہ تھا' جو اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ غالباً اس کا مقصد یہ تھا کہ چیئرمین ماؤزی تنگ کی زندگی ہی میں چین کی سیاسی اور ثقافتی قیادت ۱۵ سے ۲۵ برس کی جواں سال نسل کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے' چیئرمین ماؤزی کے فوجی لانگ مارچ کی طرح یہ ایک نئی طرز کا ذہنی لانگ مارچ تھا جو ناکام رہا اس کی ناکامی کی متعدد وجوہات تھیں۔ اگرچہ چین کی جوان نسل نے چیئرمین ماؤ کا بھرپور ساتھ دیا لیکن انقلابی جوش و خروش میں ان سے کچھ ایسی غلطیاں اور زیادتیاں سرزد ہوئیں' جن کی وجہ سے اس انقلاب کا مستقبل عوام الناس کی نظروں میں مشکوک اور مخدوش ہو کر رہ گیا۔ اس کے علاوہ اس نئی اور جوان نسل کے اوپر ادھیڑ عمر اور بوڑھے لوگوں کی کم از کم دو نسلیں بقید حیات تھیں جو چین کی سیاسی اور ثقافتی قیادت سے دستبردار ہونے کے لیے کسی قیمت پر بھی تیار نہ تھیں۔ ان دو نسلوں کے لوگ چین کی قیادت کو اپنی جائز اور ناقابل منسوخ وراثت سمجھتے تھے۔ اپنی اس وراثت پر حق قائم رکھنے کے لیے انہوں نے ثقافتی انقلاب کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ناکامی کی تیسری وجہ غالباً یہ تھی کہ چیئرمین ماؤزی تنگ ضعیف العمری کی ایسی منزل میں تھے جہاں سے نوجوانوں کے اتنے عظیم اور شدید انقلاب کو اپنی زیر نگرانی کامیابی سے ہمکنار کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر چند دوسرے لوگوں نے اس انقلاب کو اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کی۔ یہ بات چینی دانشوروں اور پارٹی لیڈروں کو قابل قبول نہ تھی۔ چنانچہ چیئرمین ماؤ کی آنکھ بند ہوتے ہی ثقافتی انقلاب نے بھی دم توڑ دیا' اور ماؤزی تنگ کی عظمت کے بت پر بھی بہت سی بدنما خراشیں چھوڑ گیا۔

چین کے دوسرے دورے کے دوران میں نے عظیم چینی شاعر اور دانشور کو مورو سے درخواست کی کہ کیا یہ ممکن ہے کہ میں ثقافتی انقلاب میں ریڈگارڈز (Red Guards) کے کسی کیمپ کو جا کر دیکھ سکوں؟

انہوں نے حامی تو نہ بھری لیکن وعدہ کیا کہ وہ کوشش کر دیکھیں گے۔ دو روز کے

For more books visit www.4Urdu.com

بعد تین لڑکوں اور تین لڑکیوں پر مشتمل ریڈ گارڈز کا ایک دستہ مجھے ایک جیپ میں بٹھا کر پکینگ سے کافی دور ایک کیمپ میں لے گیا' یہ کیمپ ایک نہایت وسیع کھلے میدان میں پھیلا ہوا تھا۔ ۱۵ سے ۲۵ برس تک کے کئی ہزار لڑکے اور لڑکیاں انتہائی منظم طور پر اس کیمپ میں خیمہ زن تھیں۔ کیمپ کی ساری آبادی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر نہایت تن دہی سے انواع و اقسام کے مشاغل میں مصروف ٹولیاں قومی اہمیت کے مختلف مسائل پر نہایت بے باکی اور گرم جوشی سے بحث و مباحثہ کر رہی تھیں۔ کسی کسی جگہ کھلی کچہریاں قائم تھیں جن میں ملک کے نامور دانشور ادیب' سیاستدان اور صنعت کار ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے تھے۔ ان کے خیالات' اعمال اور کردار پر کھلے بندوں طرح طرح کے الزم عائد کیے جا رہے تھے۔ اور ہر "ملزم" نہایت شد و مد سے اپنی صفائی پیش کرنے میں مصروف تھا۔

ریڈ گارڈز کے اس وسیع و عریض کیمپ میں ہزاروں تیز و تند اور جوانسال اذہان چقماق کے ٹکڑوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے جو انقلابی فکر و عمل کی رگڑ سے چاروں طرف شراروں کی پھلجھڑیاں چھوڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اس کیمپ میں آٹھ دس گھنٹے گزارنے کے بعد جب میں واپس لوٹا تو میرا یہی تاثر تھا کہ اگر یہ عجیب و غریب تجربہ کامیاب ہو گیا تو چین میں ایک ایسا انقلاب رونما ہو گا جو چشم فلک نے اور کہیں نہیں دیکھا اور بصورت دیگر اگر یہ تجربہ ناکام ہو گیا تو خدا جانے اس کا رد عمل کیا گل کھلائے۔

چین کے اندرونی حالات ان کا اپنا معاملہ ہیں۔ بیرونی سطح پر چین ہمیشہ پاکستان کا قابل اعتماد' پرخلوص اور وفادار دوست ثابت ہوا ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ جب چین کے ساتھ ہماری دوستی کے فراسم ابتدائی دور سے گزر رہے تھے مجھے ان تعلقات کی پیش رفت میں کسی قدر حصہ لینے کا موقع نصیب ہوا۔ وہ دن دور نہیں جب روس اور امریکہ کے علاوہ چین بھی دنیا میں تیسری سپر پاور کے طور پر ابھرنے والا ہے۔ اگر ہم نے اپنی

For more books visit www.4Urdu.com

خارجہ پالیسی میں تدبر' تشکر' تفکر اور تصور کا توازن برقرار رکھا تو مجھے یقین ہے کہ چین کے ساتھ ہماری دوستی ہر دور میں بدستور زندہ و تابندہ رہے گی۔

URDU4U.COM

○ ایران' ترکی اور آر سی ڈی

ایران اور ترکی میں ایک خاص قدر مشترک یہ تھی کہ دونوں امریکہ کے حلقہ بگوشوں میں شامل تھے۔ اس کے سوا یہ دونوں ممالک اپنے درمیان کسی قسم کا ثقافتی روایتی یا اسلامی بھائی چارہ کھلے بندوں تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ دونوں "جدیدیت" کی دلدل میں بری طرح دھنسے ہوئے تھے اور اپنی اقدار کو مغربی تہذیب و تمدن کے نام نہاد سانچوں میں ڈھالنے کی سر توڑ کرشش میں مبتلا تھے۔ بغداد پکیٹ عرف سینٹو میں شامل ہو کر ان دونوں ممالک کا رشتہ دنیائے عرب سے مزید کٹ گیا تھا۔ اور اس طرح عالم اسلام کے ساتھ بھی ان کے رابطے میں ایک خلاء کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

اس خلاء کو پر کرنا پاکستان کے مقدر میں لکھا تھا۔ اپنی گوناں گوں مغرب پرستی اور امریکہ نوازی کے باوجود پاکستان کو یہ فضیلت حاصل رہی ہے کہ اپنے اسلامی تشخص اور نصب العین کو برملا تسلیم کرنے اور اس کا ڈنکے کی چوٹ اعلان کرنے میں ہم نے کبھی کوئی حجاب یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

آزادی کے بعد پاکستان کا پہلا سرکاری دورہ کرنے والے غیر ملکی سربراہ مملکت ایران کے شہنشاہ رضا شاہ پہلوی تھے۔ سکندر مرزا صاحب کی صدارت کے دوران شاہ ایران کے ساتھ یہ دوستانہ مراسم خاص طور پر گہرے ہو گئے۔ دونوں حضرات بلاتکلف فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔ اور بیگم ناہید اسکندر مرزا کا تعلق بھی ایک معروف ایرانی قبیلے اور خاندان سے تھا۔ شاہ ایران اور صدر سکندر مرزا کے باہمی ذاتی اور سرکاری مراسم اس قدر گہرے نظر آئے تھے کہ ان کے جلو میں وقتہ فوقتہ طرح طرح کی افواہیں جنم لیتی رہتی تھیں۔

For more books visit www.4Urdu.com

اس زمانے میں اس افواہ نے بھی سر اٹھایا تھا کہ شاہ ایران کی سربراہی میں پاکستان اور ایران کی ایک متحدہ کنفیڈریشن بنانے کا منصوبہ تیار ہو رہا ہے۔ اگر اس قسم کی خواہش کہیں موجود تھی تو ممکن ہے ان دونوں سربراہوں کے ذہنوں کے نہاں خانے میں کسی جگہ پوشیدہ ہو۔ عملی سطح پر میں نے ایسی کسی تجویز کا کبھی کوئی ذکر نہیں سنا تھا۔

URDU4U.COM

اعلیٰ ترین سرکاری سطح پر تو ایران اور پاکستان کے باہمی تعلقات نہایت مستحکم اور خوشگوار تھے۔ لیکن ایرانی علما' فضلا' طلبا' اساتذہ' دانشوروں اور عوام کے ساتھ ہمارا رابطہ بے حد کمزور تھا۔ اندرون بیرون خود ایرانی حکومت کا بھی کم و بیش کچھ ایسا ہی حال تھا۔ شہنشاہ رضا شاہ پہلوی اور ان کے دربار کے برگزیدہ اراکین تہران کے ایک مخصوص حصے میں ایک ایسی الگ تھلگ مخلوق نظر آتے تھے جن کا اپنے وطن کی دوسری آبادی کے ساتھ بظاہر کوئی رشتہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ یہ حضرات فرانسیسی زبان بولنے کے رسیا تھے اور اپنی نشست و برخاست' لباس و طعام اور بود و باش میں فرانسیسی تہذیب و تمدن اور مغربی اقدار و اطوار میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے تھے۔ ایک سرکاری دورے کے دوران میں نے شمار کیا کہ ہم نے ایرانی درباریوں سمیت صبح سے شام تک چار مرتبہ اپنے لباس ہائے فاخرہ تبدیل کیے۔ مذاکرات کے وقت لاؤنج سوٹ' لنچ پر مارننگ ٹیل سوٹ۔ شام کے استقبالیہ میں بلیک ٹائی ڈنر سوٹ۔ رات کے ڈنر پر وہائٹ ٹائی ٹیل سوٹ! اسی تہران کے گلی کوچوں میں ایسے غربا اور مساکین کی کمی نہ تھی جنہیں شدید سردیوں میں بدن ڈھانپنے کے لیے پورا کپڑا تک میسر نہ تھا اور یہاتوں میں جا بجا ایسی خواتین چلتی پھرتی نظر آتی تھیں جن کے پاؤں ننگے اور برقعے تار تار تھے۔

۱۹۵۸ء میں صدر ایوب نے میجر جنرل اسکندر مرزا کو برطرف کر کے عنان اقتدار اپنے ہاتھ میں لی تو شاہ ایران اس تبدیلی پر کسی قدر برہم ضرور تھے۔ لیکن صدر ایوب نے ان کی خیر سگالی حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت اور کوشش سے کام لیا تیل کے بل بوتے پر جیسے جیسے ایران کی دولت اور فوجی قوت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی تناسب سے

For more books visit www.4Urdu.com

شاہ میں رعونت' خودسری اور فرعونیت کا مادہ بھی پروان چڑھتا گیا۔ اس کہ وجہ سے ایک طرف تو اس کے پنجہ استبداد کی گرفت ایرانی قوم پر مزید سخت ہو گئی۔ دوسری طرف ذاتی سطح پر صدر ایوب کے ساتھ اس کے تعلقات میں وہ گرمجوشی باقی نہ رہی جو کسی زمانے میں اسکندر مرزا کے ساتھ موجزن رہا کرتی تھی' بایں ہمہ پاکستان کے حق میں شاہ کے تعلقات بدستور استوار رہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر انہوں نے اپنی خیر سگالی کا عملی ثبوت بھی دیا۔ امریکہ کی لگائی ہوئی بندش کے باوجود انہوں نے خفیہ طور پر ہمیں کئی قسم کا مطلوبہ جنگی سامان فراہم کرنے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہ لیا۔ اس جنگ کے دوران امریکہ اور برطانیہ کے رویہ پر شاہ نے شدید نکتہ چینی کی اور واشنگٹن پوسٹ کے ایک انٹرویو میں گلہ کیا کہ پاکستان سینٹو کا ممبر تھا۔ اس کے باوجود ہندوستان نے اس کی سالمیت پر جارحانہ حملہ کیا' تو امریکہ اور برطانیہ نے پاکستان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایران کے ساتھ بھی ایسی ہی افتاد پیش آ سکتی ہے۔

(Washington Post کی July ۱۹۶۵ء)

۱۹۶۷ء میں جب صدر ایوب کی آٹو بائیو گرافی "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" (Friends Not Masters) شائع ہوئی' تو اس میں صدر جمال عبدالناصر کے حق میں چند توصیفی کلمات شاہ ایران کو بہت ناگوار گزرے۔ اس لیے صدر ایوب کا زوال ان کے نزدیک ایک قدرتی اور قابل قبول واقعہ تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ صدر ایوب کے جانشین جنرل آغا محمد یحییٰ تھے جو مسلکاً شیعہ تھے۔ لساناً فارسی بول سکتے تھے اور مشرباً شاہ ایران کے اس فلسفہ پر عملی طور پر کار بند تھے کہ جنسی آزادی قومی ترقی کا زینہ ہے۔

امام خمینی کے اسلامی انقلاب سے پہلے دولت کی فراوانی' اقتدار کی بد لگامی' انداز حکومت کی بدعنوانی' اور عدل و انصاف اور اخلاق کی سوختہ سامانی کے طفیل شاہ ایران ایسی منزل

For more books visit www.4Urdu.com

پر جا پہنچے تھے جس کے بعد اگلی منزل صرف عذاب الٰہی باقی رہ جاتی ہے۔ بیسوی صدی میں چشم فلک نے ایک ایسا عبرتناک نظارہ دیکھا کہ ایک شخص کے دنیا بھر میں جگہ جگہ مال و دولت کے انبار جمع ہیں۔ جابجا بڑے بڑے شاہانہ محلات اس کے انتظار میں چشم راہ کھڑے ہیں۔ لیکن زمین کی ساری وسعت اس پر سکڑ گئی ہے اور وہ اپنی قبر کے لیے دو گز زمین کی تلاش میں ساری دنیا میں مارا مارا پھر رہا ہے۔

URDU4U.COM

ایران کے برعکس ترکی میں پاکستان کی حیثیت کی نوعیت مختلف تھی۔ حکومتی سطح پر ترکی اور پاکستان کے تعلقات ہمیشہ دوستانہ اور مخلصانہ رہے ہیں۔ خاص طور پر صدر جلال بیار اور وزیراعظم عدنان مینڈرس کے دور حکومت میں ان تعلقات میں کسی حد تک ذاتی گرمجوشی کا عنصر بھی نمایا تھا۔ لیکن ان کے زوال کے بعد بھی دونوں حکومتوں کے تلعقات میں کوئی کجی کمزوری یا دشواری پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن ترک عوام میں عموماً اور سیدھی سادی دیہاتی آبادی میں خصوصاً پاکستان کے لیے ہمیشہ خیر سگالی اور عزت و احترام کا جذبہ موجزن رہا ہے۔ اس جذبے کی اصلی بنیاد ان کا اسلام کے ساتھ گہرا لگاؤ ہے۔ کیونکہ ترک عوام انتہائی سچے پکے اور جاحمیت مسلمان ہیں۔ چند مخصوص اور محدود طبقوں کی دین سے بے اعتنائی اور بے زاری کے باوجود یہ ترکی کے غیور عوام ہی کی برکت ہے کہ انہوں نے یورپ کے عین دہانے پر اپنے وطن کو اسلام کا ناقابل تسخیر قلعہ بنائے رکھا ہے۔ وہ دن بہت زیادہ دور نہیں جب وہاں پر اسلام کے نام پر شرمانے والے احساس کمتری کے مارے ہوئے مریضانہ عناصر بھی عفو معطل ہو کر رفتہ رفتہ پردہ عدم میں روپوش ہو جائیں گے۔

بغداد پکیٹ عرف سینٹو میں شمولیت کی وجہ سے دنیائے عرب کی ایران' ترکی اور پاکستان کے ساتھ بے گانگی اور برگشتگی کا احساس کافی شدید حد تک بڑھ چکا تھا حکومتی سطح پر ایران اور ترکی کو اس صورت حال سے کوئی خاص پریشانی لاحق نہ تھی۔ لیکن عربوں کے ساتھ ہمارے جذباتی اور روایتی لگاؤ اور اسلام کے ساتھ ہماری کھلم کھلا وابستگی کے

For more books visit www.4Urdu.com

پیش نظر پاکستان کے لیے یہ صورت باعث تشویش تھی۔ صدر ایوب کا خیال تھا کہ سینٹو کی مخالفت اس وجہ سے ہے کہ اسی پکیٹ کی نوعیت سیاسی اور فوجی ہے۔ اس مخالفت کا زور توڑنے کے لیے انہوں نے ہمخیال ممالک کے مابین تجارتی' ثقافتی اور معاشی تعاون کے لیے کوئی مناسب ادارہ قائم کرنے کا ڈول ڈالا۔ یہ خیال شاہ ایران اور ترکی کے صدر گورسل اور وزیراعظم عصمت اتونو کو بھی پسند آیا۔ شاہ نے اپنے طور پر افغانستان کو بھی اس نئے معاہدے میں شامل کرنے کی سر توڑ کوشش کی جس میں وہ ناکام رہے۔ اس طرح ۱۹۶۴ء میں آر۔ سی۔ ڈی کا ادارہ وجود میں آیا۔

○ صدر ناصر

نومبر ۱۹۶۰ء میں مصر کا سرکاری دورہ کرنے سے پہلے صدر ایوب کے دل میں صدر ناصر کے متعلق وہی جذبات اور تعصّبات موجود تھے جو اس زمانے میں دوسرے بہت سے پاکستانیوں کے دلوں میں موجزن تھے۔ برسر اقتدار آنے کے بعد صدر ناصر نے جس سختی سے اخوان المسلمین کی تحریک کو کچلنا شروع کر دیا تھا' اس کی وجہ سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں رنج و اضطراب کی ایک لہر دوڑی ہوئی تھی' دنیائے عرب کے عین منجدھار مصر میں روس کا بظاہر بے تحاشا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ بھی عالم اسلام کے نزدیک کوئی نیک فال تصور نہ کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اتحاد المسلمین کی بجائے جب صدر ناصر نے عرب نیشنلزم کا نعرہ انتہائی زور و شور سے اپنا لیا تو یہ بات بھی بہت سے پاکستانیوں کے نزدیک بڑی مایوس کن تھی۔ اس کے علاوہ نہر سویز پر فرانسیسی اور برطانوی حملے کے موقع پر پاکستانی حکومت اور اس کے نمائندوں نے جس بے تدبیری' بے حسی اور غیر مروتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس پر صدر ناصر کو قدرتی طور پر اس قدر شدید غم و غصہ تھا کہ اپنی ایک تقریر میں انہوں نے پاکستان کو "مغربی سامراجیت کے زرخرید غلام" کے لقب سے نوازا تھا۔ اسی غیظ و غصہ کے عالم میں انہوں نے ایک اور موقع پر یہاں تک کہہ دیا تھا کہ نہر

For more books visit www.4Urdu.com

سویز مصر کو اتنی ہی عزیز ہے جس قدر کہ کشمیر ہندوستان کو عزیز ہے۔ ان افسوسناک واقعات کی وجہ سے پاکستان میں صدر ناصر کی شخصیت ملے جلے جذبات اور طرح طرح کے شک و شبہات کی دھول میں اٹی ہوئی تھی۔

URDU4U.COM

قاہرہ میں چند روز کی ملاقاتوں اور مذاکرات کے بعد صدر ایوب کے ذہن سے صدر ناصر کی ذات پر جمی ہوئی گرد بڑی حد تک چھٹ گئی۔ جمال عبدالناصر کے کردار میں کوئی بدنما پیچ و خم نہ تھا۔ وہ صوم و صلوٰہ کے پابند تھے اور ان کے چہرے مہرے سے صدق و صفا' خلوص اور دیانتداری کی پھوار ٹپکتی تھی ان کی گفتگو میں سادگی' متانت اور (directness) راستی کا رنگ غالب تھا۔ مذاکرات کے پہلے ہی دور میں انہوں نے بچپن ہی سے اسلام کے ساتھ اپنی والہانہ وابستگی' شاہ فاروق کے عہد میں مصر کی شدید پستی' جنرل نجیب کے ساتھ اختلافات کی وجوہات' اقتدار میں آنے کے بعد علمائے دین کے ایک طبقہ کے ساتھ ذہنی اور نظریاتی کشمکش' مصر میں امریکہ کے عزائم اور پالیسیوں کی طرف سے بے یقینی اور مایوسی اور رد عمل کے طور پر مصر کا روس کی جانب جھکاؤ کی تفصیلات پر ایسا سنجیدہ' مدبرانہ اور متوازن تبصرہ کیا جس میں صدر ناصر کے جذبات اور احساسات کی دلسوزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

ایک موقع پر صدر ایوب نے کہا "تاریخ میں پہلی بار یہ موقع آیا ہے کہ بہت سے اسلامی ممالک حقیقی طور پر آزاد اور خود مختار ہوئے ہیں۔ کیا میرا اور آپ کا یہ فرض نہیں کہ ہم مل کر غیر مسلم ممالک میں اسلام کی تبلیغ اور ترویج کے لیے بھی کوئی عملی قدم اٹھائیں؟"

یہ سن کر صدر ناصر نے بے اختیار اپنی نشست سے کسی قدر اٹھے اور جذبات میں بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ "آپ کی بابت تو میں کچھ نہیں جانتا۔ صرف اپنے متعلق کہتا ہوں کہ میں اپنے اس فرض سے لمحہ بھر کے لیے بھی غافل نہیں ہوں۔"

اس کے بعد صدر ناصر نے وضاحت کی کہ غیر جانبدارانہ تحریک کے ساتھ ان کی وابستگی

For more books visit www.4Urdu.com

اور روس کے ساتھ سفارتی اور سیاسی گٹھ جوڑ' یہ سب دنیاداری کے دھندے ہیں۔ توشہ آخرت کے طور پر وہ صرف دین کی خدمت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اعداد و شمار کی مدد سے ہمیں کئی منصوبے بتائے جن کے ذریعہ وہ افریقہ کے کئی ملکوں میں تبلیغ اسلام کے لیے کیا کیا خدمات سرانجام دے رہے تھے۔

صدر ایوب نے چند بار صدر ناصر کو گھیر گھار کر کشمیر کے موضوع پر لانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہایت چابک دستی سے طرح دیکر اس موضوع پر کچھ کہنے سے کنی کترا جاتے تھے۔ پھر اچانک نیشنل یونین کے ایک عظیم الشان جلسہ میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ رونما ہوا۔ یہاں پر صدر ناصر نے ایک طویل اور ولولہ انگیز تقریر کی جس کے دوران سامعین نے عموماً اور نوجوان طبقہ نے خصوصاً بار بار فلک شگاف نعرے بلند کر کے تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے۔ اس تقریر میں دنیا بھر کے مسائل کا ذکر تھا۔ لیکن بے چارے پاکستان کے کسی مسئلہ کی طرف ہلکا سا بھی اشارہ موجود نہ تھا۔ جب صدر ایوب کی باری آئی تو انہوں نے اپنی پہلے سے تیار شدہ تقریر لپیٹ کر ایک طرف رکھدی اور نہایت دھیمے اور پروقار لہجے میں گھنٹہ بھر ایک انتہائی مدلل اور موثر فی البدیہہ تقریر کرتے رہے۔ ان کی کھری کھری باتیں سن کر پہلے تو سامعین پر سناٹا سا چھایا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ نوجوان طبقہ نے ان کی باتوں کا اثر قبول کر کے وقتہ فوقتہ نہایت پرجوش نعرے لگانا شروع کر دیے۔

صدر ایوب نے اپنی تقریر میں تاریخی حوالے دے کر فلسطین سمیت دنیائے عرب کے ہر مسئلہ پر پاکستان کی بھرپور حمایت اور یکجہتی کا احوال بیان کیا۔ اور کسی قدر دکھ کے ساتھ گلہ کیا کہ پاکستان کو اپنی گوناں گوں مشکلات اور مسائل میں عربوں کی ہمدردی اور حمایت کا ابھی تک انتظار ہے۔ اس موقعہ پر انہوں نے صدر ناصر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہلکا سا توقف کیا اور پھر ڈرامائی انداز میں کہا۔ "مستقبل میں ہمیں آپ کی جواں سال قیادت سے بہت سے خوشگوار امیدیں ہیں۔" اس فقرے پر سارا ہال تالیوں

For more books visit www.4Urdu.com

سے گونج اٹھا' اور سامعین نے صدر ایوب اور صدر ناصر کے حق میں نہایت پرجوش نعرے لگائے۔

صدر ناصر نے صدر ایوب کی فی البدیہہ تقریر نہایت غور اور توجہ سے سنی۔ میں قریب ہی بیٹھا ٹکٹکی باندھ کر ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ان کا ردعمل بھانپتا رہا۔ میرا اندازہ ہے کہ ایک دو مقامات پر وہ کسی قدر کھسیانے ہو کر مسکرائے۔

صدر ایوب کی تقریر ختم ہوئی تو صدر ناصر نے نہایت گرمجوشی سے ان کے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا۔

(Truth and sincerity win the hearts of people. Indeed there is no sub-stitute for truth and sincerity)

(سچائی اور خلوص لوگوں کا دل جیت لیتے ہیں' بے شک سچائی اور خلوص کا کچھ نعم البدل نہیں۔"

مصر کے اس دورہ نے یہ حقیقت صدر ایوب پر روز روشن کی طرح عیاں کر دی تھی کہ مشرق وسطیٰ میں صدر ناصر کے مقابلے میں کسی اور رہنما کا چراغ جلنا ناممکن ہے۔ اس بات کا اعتراف انہوں نے اپنی کتاب (Friends Not Masters) میں کسی قدر محتاط انداز سے کیا' تو شاہنشاہ ایران اس پر چراغ پا ہو گئے۔

صدر ناصر کا انجام دل شکستگی' ناکامی اور مایوسی کی آغوش میں ہوا۔ زندگی بھر ان کے انقلابی فلسفہ کا کوئی مقدمہ یا منصوبہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ عرب نیشنلزم کا بلند بانگ نعرہ کھوکھلا ثابت ہوا۔ بین المملکتی سطح پر مصر اور شام کا اتحاد تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ گیا۔ تنظیم آزاد فلسطین کی پامالی اور شکست و ریخت کا عمل بھی ان کی آنکھوں کے سامنے شروع ہو چکا تھا۔ خاص طور پر اردن میں مہاجرین فلسطین کے کیمپوں پر ظلم و ستم کے جو پہاڑ توڑے گئے۔ وہ ان کی ناکامیوں کے تابوت کا آخری کیل تھے۔

صدر ایوب کے دورہ مصر کے نو برس بعد مجھے ایک بار پھر صدر ناصر سے ملاقات کا موقع نصیب ہوا۔ صدر ایوب کے زوال کے بعد جنرل یحییٰ پاکستان میں برسراقتدار آ گئے تھے۔

For more books visit www.4Urdu.com

میں بھی ملازمت سے مستعفی ہو کر ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ تاہم میں ذاتی حیثیت سے یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کا ممبر منتخب ہو چکا تھا۔ ان دنوں عرب ممالک یہ شکایت کر رہے تھے کہ یروشلم سمیت مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیل نے فلسطینی مہاجر بچوں کے لیے یونیسکو کے قائم کردہ سکولوں میں یہودی استاد تعینات کر کے غیر اسلامی نصاب تعلیم جاری کر دیا ہے۔ یونیسکو کے اپنے ذرائع سے جب ان شکایات کی خاطر خواہ تصدیق نہ ہو سکی تو میں نے اسرائیل کا خفیہ دورہ کر کے اصل صورت حال تحقیق کرنے کی پیشکش کی۔ اس منصوبہ کو صدر ناصر کی منظوری اور سرپرستی حاصل تھی۔ اسی سلسلے میں انہوں نے مجھے قاہرہ طلب کر کے ملاقات کا موقع دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ پچھلے نو برس کے دوران صدر ناصر کی شخصیت میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ اب وہ جسمانی اور ذہنی طور پر اپنی عمر سے بہت زیادہ بوڑھے نظر آتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اولوالعزمی کی وہ پہلی سی چمک دمک ماند پڑ چکی تھی۔ مغرب کا وقت آنے پر انہوں نے نماز تو ضرور ادا کی' لیکن مجموعی طور پر اسلام کے متعلق ان کے نظریات اب کسی قدر زنگ آلود نظر آتے تھے۔ وہ اس بات پر خوش تھے کہ مصر کے دانشوروں کی نئی نسل مصر کی عظمت کے ڈانڈے دور فراعنہ کی تہذیب و تمدن کے ساتھ ملانے میں کوئی حجاب یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ خاص طور پر وہ اس پر بھی مطمئن تھے کہ نوجوان لڑکیوں کے زیورات اور بناؤ سنگھار کا فیشن دن بدن فرعونوں کے زمانے کی سج دھج میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ صدر ناصر کافی دیر قوموں میں تسلسل ثقافت کی اہمیت پر کسی قدر بے سروپا باتیں کرتے رہے۔ان کے نزدیک مصر کی تاریخی عظمت میں کئی دوسری تحریکوں کی طرح اسلام کی تحریک کا بھی اہم حصہ تھا۔ ان کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ دوام تاریخ کو حاصل ہے تحریک کو نہیں۔

جس طرح دنیائے عرب اور بین الاقوامی سیاست میں صدر ناصر منفی اثرات کے علاوہ کوئی تعمیری کردار ادا نہ کر سکے۔ اسی طرح غالباً آخری عمر میں وہ اپنی ذہنی اور باطنی دنیا

For more books visit www.4Urdu.com

میں بھی انتشار' اضطراب' ابتری اور پراگندگی کا شکار رہے۔ یہ ایک ایسے انسان کی عبرتناک مثال ہے جس کی خوبیوں پر اس کی بے برکتیاں غالب آ گئیں۔

URDU4U.COM

## ○ صدر ایوب کے دیگر غیر ملکی دورے

صدر ایوب کے اور بھی کئی غیر ملکی دوروں میں مجھے ان کی ہمراہی کا موقع حاصل ہوا۔ ان ممالک میں برطانیہ' کینیڈا' مغربی جرمنی' یوگوسلاویہ' لبنان' عراق' سعودی عرب' برما' فلپائن' ہانگ کانگ' سنگاپور' انڈونیشیا اور جاپان شامل تھے۔ اس کے علاوہ اپریل ۱۹۶۵ء میں وہ روس بھی گئے تھے۔ اس زمانے میں ہالینڈ میں میں بطور سفیر متعین تھا۔ اس لیے ان کے اس اہم دورے کا مجھے ذاتی طور پر کوئی علم نہیں۔ البتہ صدر ایوب کے دل میں یہ خوش فہمی قائم تھی کہ اس دورے کی وجہ سے وہ پاکستان کے متعلق روسی لیڈروں کے دل میں جمی ہوئی سردمہری کی برف کو کسی حد تک پگھلانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

## ○ لندن

کامن ویلتھ وزرائے اعظم کانفرنس میں شرکت کے لیے صدر ایوب قریباً قریباً ہر دوسرے برس لندن جایا کرتے تھے۔ اس کانفرنس میں کوئی بڑا مسئلہ تو کبھی حل نہ ہوا لیکن انگلستان میں بسے ہوئے لاکھوں تارکین وطن کی فلاح و بہبود کے لیے یہ اجتماع اکثر و بیشتر سود مند ثابت ہو جایا کرتا تھا۔ یوں بھی دولت مشترکہ کی حکومتوں کے سربراہوں کا میل جول باہمی خیر سگالی کو فروغ دینے کا ایک اچھا ذریعہ تھا۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر صدر ایوب نے ایک دو بار پنڈت نہرو کے ساتھ کشمیر کے بارے میں کچھ مفید مطلب گفتگو کرنے کی کوشش ضرور کی۔ لیکن ہر بار پنڈت جی چکنا گھڑا ہی ثابت

For more books visit www.4Urdu.com

ہوتے رہے۔

میرے خیال میں کامن ویلتھ سے ہماری علیحدگی جلد بازی سے کیا ہوا ایک غیر دانش مندانہ فیصلہ تھا۔ ہمارے اس احتجاج سے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی بلکہ الٹا پاکستان ہی ایک بنے بنائے بین الاقوامی فورم پر کوئی موثر کردار ادا کرنے سے محروم ہو گیا۔

کامن ویلتھ کی برادری میں ہمارے دوبارہ شامل ہونے کی خواہش اور کوشش کے جواب میں زبانی کلامی تو سب ہمارا ساتھ دینے کی حامی بھرتے ہیں لیکن عملی طور پر ابھی تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ یقیناً ہندوستان ہماری کامن ویلتھ میں ازسر نو شمولیت کی راہ میں طرح طرح کے روڑے اٹکانے میں کوئی دقیقہ فردگذاشت نہ کرے گا۔

اس کے علاوہ برطانیہ اور چند دیگر ممالک بھی غالباً یہی چاہتے ہیں کہ عبرت کے طور پر ہماری اچھی طرح ناک رگڑوائے بغیر کامن ویلتھ میں ہماری واپسی کی راہ بعجلت اور باآسانی ہموار نہ ہو۔

ایک روز لندن میں اتفاقاً میری ملاقات بیگم ناہید اسکندر مرزا سے ہو گئی وہ ٹوکری ہاتھ میں لیے ایک دکان سے سبزی خرید رہی تھیں۔ پہلے تو انہوں نے کنی کترا کر مجھے نظرانداز کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے بڑھ کر سلام کیا تو بڑی خندہ پیشانی سے ملیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اگر میں ان کے میاں سے ملاقات کرنے ان کے ہاں آنا چاہوں تو اس میں کوئی اعتراض کی بات تو نہیں؟

انہوں نے جواب دیا۔ "ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ تمہارے باس ایوب خاں کو ضرور اعتراض ہو گا۔"

میں نے کہا کہ میں صدر ایوب سے اجازت لے کر ہی ملنے آؤں گا

بیگم ناہید مرزا بولیں۔ "ایوب خاں شکی مزاج کا آدمی ہے۔ اپنا برا بھلا سوچ سمجھ کر اجازت مانگنا۔"

میرے اصرار پر انہوں نے مجھے اپنا ایڈریس اور ٹیلیفون نمبر دے دیا جو خفیہ رکھنے کی غرض سے انہوں نے ٹیلیفون ڈائریکٹری میں درج نہ کروائے تھے۔

For more books visit www.4Urdu.com

اپنے ہوٹل واپس آ کر میں نے صدر ایوب کو بیگم مرزا سے ملاقات کا واقعہ سنایا تو ان کے ہونٹوں پر ایک کینہ ورانہ سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور وہ بولے۔ "اچھا تو بیگم صاحبہ اب ٹوکری اٹھائے سبزی خریدتی پھر رہی ہیں۔ ایک زمانے میں ان کا دماغ اتنا بگڑا ہوا تھا کہ وہ پاکستان کی ملکہ بننے کے خواب دیکھا کرتی تھیں۔"

URDU4U.COM

میں نے صدر ایوب سے اسکندر مرزا صاحب کو ملنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے حیرت سے مجھے گھور کر دیکھا' اور کہا۔ "کیا ضرورت ہے ملنے کی؟"

میں نے وضاحت کی کہ میں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے اور معزولی کے عین بعد ایوان صدارت سے رخصت کے وقت وہ میرے لیے ایک فاؤنٹین پن کا تحفہ بھی چھوڑ گئے تھے۔ اس لیے میرا جی چاہتا ہے کہ میں خود مل کر ان کا شکریہ ادا کروں۔

صدر ایوب نے کسی قدر سوچ کر جواب دیا۔ "تم اصرار کرتے ہو تو تھوڑی دیر مل آؤ۔ اسکندر چرب زبان آدمی ہے۔ اس کی باتوں پر زیادہ دھیان نہ دینا۔"

میں ٹیلیفون پر وقت طے کر کے رات کے ساڑھے نو بجے اسکندر مرزا صاحب کے ہاں پہنچا۔ فلیٹ کی گھنٹی بجائی تو بیگم مرزا نے دروازہ کھولا۔ ہائیڈ پارک کے قرب میں اچھا خاصا کشادہ فلیٹ تھا جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ کسی پاکستانی صنعتکار نے انہیں رہائش کے لیے دے رکھا تھا۔ فرنیچر کافی پرانا اور معمولی تھا۔ باقی ساز و سامان بھی کسی قدر بوسیدہ نظر آتا تھا۔ اسکندر مرزا صاحب ڈریسنگ گاؤن پہنے ڈرائینگ روم میں کھڑے وہسکی پی رہے تھے۔ غالباً انہیں ثقل سماعت کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ اونچا سنتے تھے' اور خود بھی بلاوجہ اونچا بولتے تھے۔ بیگم مرزا نے مجھے کافی بنا کر پلائی اور ایوان صدر کراچی سے اپنے اخراج کا واقعہ کسی قدر تلخ لہجے میں سنایا۔ انہیں خاص طور پر یہ گلہ تھا کہ جو جرنیل صاحبان اسکندر مرزا سے استعفیٰ طلب کرنے آئے تھے وہ ڈراوے کے طور پر اپنے ساتھ ایک موٹا سا بریگیڈیئر بھی لائے تھے جس نے جارحانہ طور پر ایک فوجی پستول بھی اپنی کمر سے لٹکا رکھا تھا!

For more books visit www.4Urdu.com

اسکندر مرزا صاحب نے پاکستان یا صدر ایوب کے متعلق میرے سامنے کوئی بات نہ کی۔ وہ زیادہ تر اپنی گرتی ہوئی صحت اور لندن میں زندگی کی مشکلات کا رونا روتے رہے۔ قریباً نصف گھنٹہ گزرنے کے بعد انہوں نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا۔ "تمہارے آنے کا شکریہ! میرا خیال ہے اب تمہیں چلا جانا چاہیے۔"

بیگم مرزا نے کہا۔ "آغا اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو یہ آیا ہے۔"

"نہیں خانم۔" اسکندر مرزا صاحب بولے۔ "کچھ بعید نہیں کہ دوسری جانب بھی کوئی گھڑی لیے حساب لگا رہا ہو کہ یہ کتنی دیر یہاں بیٹھا ہے۔"

اسکندر مرزا صاحب طبعہ شاہ خرچ انسان تھے۔ ان کے کئی دوسرے ملنے والوں سے میں نے یہی سنا کہ لندن میں اکثر انہیں تنگدستی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ ان کے ذی اثر انگریز دوستوں نے انہیں چند رئیسانہ کلبوں کا ممبر مفت بنوا دیا تھا جہاں وہ اپنا برج کھیلنے کا شوق باآسانی پورا کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ریجنٹ سٹریٹ میں ویرا سوامی ریسٹورنٹ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے انہیں اپنے شعبہ ایکسپورٹ کا ڈائریکٹر بھی نامزد کر رکھا تھا' جہاں سے انہیں کوئی معقول معاوضہ بھی ضرور ملتا ہو گا۔ لیکن کراچی کے ایوان صدر میں تین ساڑھے تین برس داد عیش دینے کے بعد لندن میں کسمپرسی کی زندگی کا دونوں میاں بیوی کے لیے سوہان روح ثابت ہونا ایک لازمی اور قدرتی امر تھا۔

## ○ مارشل ٹیٹو

یوگوسلاویہ کے دورے پر مارشل ٹیٹو سے ہماری ملاقات ایک نہایت دلکش اور فرحت بخش تجربہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں مارشل ٹیٹو ہٹلر اور مسولینی کے خلاف اپنے وطن کی آزادی کے لیے ایک گوریلا جنگی ہیرو کے طور پر عالمی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ جنگ

For more books visit www.4Urdu.com

کے بعد روس سے ایک زبردست نظریاتی ٹکر لے کر انہوں نے یوگوسلاویہ کو ایک نسبتاً آزاد' کشادہ اور غیر متشدد طرز اشتراکیت کی راہ پر ڈال دیا تھا۔ غیر جانبدارانہ تحریک کی تخلیق' قیام اور فروغ میں بھی ان کا نام سر فہرست تھا۔ صدر ایوب کے ساتھ مذاکرات کے دوران مارشل ٹیٹو کی شخصیت کا نقش بڑا رفیع الشان اور پر شوکت طور پر ابھرا۔ واقعات عالم کا عموماً اور پاکستان کے مسائل کا خصوصاً انہیں گہرا شعور تھا۔ خاص طور پر مسئلہ کشمیر پر ان کی سوجھ بوجھ انتہائی منصفانہ اور حقیقت پسندانہ تھی۔ غیر جانبدارانہ تحریک کے حوالے سے ان کے پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ بیحد گہرے ذہنی اور سیاسی رشتے تھے لیکن مسئلہ کشمیر پر انہوں نے اپنا موقف انصاف اور حقائق کی بنیادوں پر ہی استوار رکھا۔ اور استصواب رائے کی تجویز کے خلاف کچھ نہ بولے ایسی سطح کے بے لاگ اور باوقار مدبر کے سامنے صدر ناصر جیسے رہنما کو تاہ قد بالشتیے نظر آتے تھے جو عارضی مصلحتوں اور ذاتی مروتوں کے اپچ پیچ میں الجھ کر منصفانہ اصولوں کی حمایت سے بھی منحرف ہو جاتے تھے۔

○ صدر سوئیکارنو

انڈونیشیا کے دورے میں صدر ایوب کی صدر احمد سوئیکارنو سے خوب گاڑھی چھنی۔ ان دونوں حضرات کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ڈاکٹر سوئیکارنو لہو و لعب کے رسیا تھے اور ان کے کردار میں شوخی' چلبلاہٹ اور زندہ دلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سرکاری ضیافتوں اور دوسری تقریبات سے فارغ ہو کر صدر ایوب تو رات دس یا گیارہ بجے تک سونے کے لیے چلے جاتے تھے لیکن صدر سوئیکارنو چیدہ چیدہ مہمانوں کو روک کر ڈانس ہال میں رقص و سرود کی محفل گرم کرتے تھے۔ تین تین چار چار گھنٹے تک مغربی اور انڈونیشی ڈانس اپنا رنگ جماتے تھے جنمیں ڈاکٹر سوئیکارنو خود بھی انتہائی ولولے اور انہماک سے حصہ لیتے تھے' صبح کے تین یا چار بجے کے قریب یہ مجلس برخاست ہوتی

For more books visit www.4Urdu.com

تھی۔ نہ معلوم وہ سوتے کب تھے کیونکہ صبح سات بجے دن کی پہلی تقریب میں صدر سوئیکارنو ہشاش بشاش' چاق و چوبند تا نہ دم موجود نظر آتے تھے۔

URDU4U.COM

صدر سوئیکارنو بے حد نازک مزاج اور نفاست پسند طبیعت کے مالک تھے۔ وہ دن بھر میں تین یا چار بار لباس تبدیل کرتے تھے اور موقع و محل کے حساب سے بری یا بحری یا ہوائی فوج کی وردی زیب تن فرماتے تھے۔ کسی مقام پر چلتے چلتے اگر چند قدم بھی دھوپ آ جاتی تھی تو ایک اے۔ ڈی۔ سی لپک کر انہیں سولا ہیٹ پیش کر دیتا تھا' اس کے بعد چھاؤں میں قدم رکھتے ہی وہ فوراً دوسری ٹوپی پہن لیتے تھے۔ اسی طرح لکھنے پڑھنے کے علاوہ دھوپ اور چھاؤں میں استعمال ہونے والی عینکیں بھی وہ بار بار تبدیل کرتے تھے جو ان کے اے۔ ڈی۔ سی نہایت پابندی اور اہتمام سے ان کی خدمت میں پیش کرتے رہتے تھے۔

صدر ایوب کو اپنے ہمراہ لے کر صدر سوئیکارنو جہاں کہیں جاتے تھے رنگ برنگ کے کپڑوں میں ملبوس نوجوان لڑکیاں دور رویہ قطاروں میں کھڑے ہو یر ان کا استقبال کرتی تھیں اور پھولوں کی پتیاں ان پر نچھاور کرتی تھیں۔ پھر انڈونیشی ترانوں کے ساتھ کچھ رقص پیش کیے جاتے تھے اور اس کے بعد کسی دوسرے پروگرام کی باری آتی تھی۔

خاص طور پر جزیرہ بالی میں بالکل پرستان کا سماں تھا۔ چاروں طرف پھولوں سے لدی ہوئی نازک اندام پراچین عورتوں کے جھنڈ کے جھنڈ جگہ جگہ محو رقص و سرود تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جزیرے کی ساری آبادی کا واحد نصب العین گانا اور ناچنا ہے۔ جزیرے کی دوشیزائیں قدم قدم پر صدر سوئیکارنو کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تھیں اور وہ ان کے درمیان راجہ اندر کی طرح گھل مل کر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔

بندونگ میں صدر سوئیکارنو نے ایک جلسہ عام سے خطاب کیا۔ اپنے زور خطابت کا کمال دکھانے وہ صدر ایوب کو بھی اس جلسے میں لے گئے۔ چار پانچ لاکھ کا مجمع تھا۔ صدر سوئیکارنو ڈیڑھ گھنٹہ تک بے تکان بولتے رہے۔ وہ ایسے جادو بیان مقرر تھے کہ لاکھوں کا ہجوم دم بخود انتہائی خاموشی سے انہیں سنتا رہتا تھا۔ پھر اچانک وہ سامعین میں جوش

For more books visit www.4Urdu.com


و خروش کی ایسی بجلی دوڑاتے تھے کہ سارا مجمع سمندر کے جوار بھاٹے کی لہروں کی طرح تہہ و بالا ہو جاتا تھا۔ اس جوش و خروش اور زیر و زبر میں بہت سے لوگ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ اور رفاہ عامہ کے رضاکار انہیں ایمبولینسوں میں ڈال ڈال کر ہسپتال لے جاتے تھے۔ صدر سوئیکارنو کی تقریر انڈونیشی زبان میں تھی۔ لیکن انہوں نے جگہ جگہ قرآن شریف کی چھوٹی چھوٹی عربی آیات بھی بکثرت استعمال کیں۔ اس کے علاوہ وہ متعدد بار ولندیزی زبان میں بھی گرجے برسے۔ میرے ساتھ مامور مترجم لڑکی نے بتایا کہ غصے میں آ کر صدر سوئیکارنو جب کسی کو ڈانٹتے ہیں یا گالی دیتے ہیں تو ایسے موقع پر بے اختیار ڈچ زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ غلامی کے دور میں انڈونیشی قوم نے ڈچ زبان میں گالی گلوچ اور ڈانٹ ڈپٹ سنتے سنتے کئی صدیاں گزاری ہیں۔ غالباً اسی لیے ڈانٹ اور دشنام کے لیے یہ زبان اب ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے!

صدر سوئیکارنو مغربی سامراجیت کی عجیب و غریب کہانیاں بیان کرنے کے بڑے شوقین تھے۔ ایک محفل میں انہوں نے انگریزی زبان کے متعلق ایک لطیفہ اس طرح سنایا۔

"In their arrogance and superiority complex، the ritish imperialists did not refrain even from corrupting their own language. For instance، their grammar says that the word "arrive" should be followed by the "at" So you arrive at Washington، at Rome، at erlin، at cario، at Karachi، Delhi، at Jakarta، at Tokyo، in short، at every place in the world except London - the capital of ritish Empire. ccording to the Standard english grammar، you arrive not at but in London."

مذاکرات میں صدر سوئیکارنو کی ہمدردیاں واضح طور پر پاکستان کے ساتھ تھیں وہ پنڈت نہرو سے بالکل مرعوب نہ آتے تھے۔ بلکہ پنڈت جی کی دانشوری میں حیلہ سازی اور مکاری کی ملاوٹ خوب بھانپ چکے تھے۔ اس کے علاوہ ایشیا کی قیادت کا سہرا اپنے سر باندھنے کا جو خناس پنڈت جی کے دماغ میں سمایا ہوا تھا وہ بھی ڈاکٹر سوئیکارنو کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھا۔ وہ روس اور امریکہ دونوں سے کسی قدر بددل اور مایوس تھے اور چین کی جانب ان کا جھکاؤ صاف اور غیر مبہم تھا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں انہوں نے جس

For more books visit www.4Urdu.com

کھلے دل سے ہماری عملی مدد کی اسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

صدر سوئیکارنو کی پالیسیوں کی وجہ سے روس اور امریکہ ان کے برابر کے دشمن تھے۔ ۱۹۶۵ء کے بعد سے بھارت بھی ان کے خون کا پیاسا تھا۔ انڈونیشی عوام میں وہ اس قدر مقبول تھے کہ کوئی اندرونی سازش ان کا بال بیکا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے کہ جی بی اور سی آئی اے دونوں کی ساز باز اور سانٹھ گانٹھ بروئے کار آئی' اور دنیا کی دو متصادم اور متحارب سپر پاورز کے اشتراک عمل نے انڈونیشی قوم کو اس کے محبوب "بنگ کارنو" (عظیم بھائی) سے محروم کر دیا۔

جس زمانے میں صدر سوئیکارنو انڈونیشیا میں اقتدار سے معزول ہوئے۔ اس وقت میں ہالینڈ میں بطور سفیر متعین تھا۔ میں نے چند نہایت اہم' نازک اور خفیہ ذرائع سے صدر سوئیکارنو کے خلاف سازشوں کی تفصیلات معلوم کر کے صدر ایوب کو ایک (Top Secret) رپورٹ بھیجی تھی۔ اس رپورٹ میں میں نے ان خطوط کی نشاندہی بھی کی تھی کہ جن پر پاکستان میں ان کے خلاف بھی ہلچل اور کھلبلی نمودار ہونے کا امکان تھا۔ اس وقت تو صدر ایوب نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی لیکن جب ان کے خلاف چلنے والی تحریک اپنے عروج پر تھی تو ایک روز انہوں نے کسی قدر حسرت سے مجھے کہا۔ "آج میں نے تمہاری ہالینڈ والی رپورٹ پھر نکلوا کر پڑھی ہے۔ بے شک تمہارے سب اندازے صحیح تھے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔"

## ○ جاپان

جاپان کے دورے میں جب ہم ٹوکیو پہنچے تو ہمیں شہنشاہ ہیروہتو کے ایک ذاتی محل میں ٹھہرایا گیا جو خاص خاص مواقع پر مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں شکست کے بعد جاپان کی ثقافت بظاہر امریکی اثرات کی زد میں آ گئی تھی۔

For more books visit www.4Urdu.com

لیکن دراصل اس قوم کی روح اپنی قدیمی روایات اور اقدار کے جادہ سے ذرا بھی نہ بھٹکی تھی' بے شک جاپانیوں کے دماغ جدیدیت کی روشنی سے منور تھے لیکن ان کے دل بدستور قدامت کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ تھے۔ غیر ملکی سیاحوں کی لطف اندوزی کے لیے انہوں نے اپنی گیشاؤں کو روایتی کیمینو پہنا کر بڑے بڑے عالیشان نائٹ کلبوں کی زینت بنا دیا تھا۔ لیکن گھروں کی چاردیواری میں جاپان کے اپنے قدیمی رہن سہن' لباس' خوراک' پوشاک اور رسوم و رواج کا چلن مسلسل اور غیر منقطع طور پر جاری و ساری تھا۔ اگرچہ مذہب کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی لیکن شہنشاہ پرستی کے جذبہ میں کوئی فرق نہ آیا تھا' اگر کوئی جاپانی باہر بازار میں ہم میں سے کسی کے پاس شاہی مہمان خانے کا سگریٹ یا ماچس کی ڈبیا کا کاغذ کا پنکن دیکھ لیتا تھا جس پر بادشاہ کے ذاتی نشان کی علامت ثبت ہوتی تھی تو فرط حیرت و عقیدت سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی تھیں اور وہ ہماری طرف یوں دیکھنے لگتے تھے جیسے ہم کسی دوسرے خلائی کرہ کی مخلوق ہوں' ہماری پارٹی کا ایک رکن کسی دکان میں سوٹ کیس خریدنے گیا۔ اس کے ہاتھ میں مہمان خانے کی ایک ماچس کی ڈبیہ تھی جس پر بادشاہی emblem کا نشان ثبت تھا۔ دکاندار نے پہلے تو وہ ڈبیہ لے کر چوما اور سر آنکھوں سے لگایا اور پھر نہایت لجاجت سے یہ ڈبیہ اپنے پاس رکھنے کے لیے مانگ لی۔ ہمارے دوست نے بخوشی اسے دے دی۔ شکرانے کے طور پر دکاندار نے سوٹ کیس کی قیمت وصول نہ کی۔

پوری جاپانی قوم جس محنت اور لگن سے دن رات محنت کرنے کی عادی ہے اس کی مثال دنیا بھر میں اور کہیں نہیں ملتی۔ ہم نے ملک بھر میں کوئی بھک منگا نہیں دیکھا۔ زمین کی اصل قدر و قیمت بھی جاپان میں نظر آئی۔ وہاں پر آبادی زیادہ اور زمین کی وسعت کم ہے جہاں کہیں بھی اراضی کا کوئی قطعہ موجود ہے' وہ لازمی طور پر تعمیراتی' یا صنعتی یا زرعی مقاصد کے لیے زیر استعمال ہے۔ ہم نے ریل اور موٹر کار کے ذریعہ جاپان میں کئی لمبے سفر کیے۔ ہمیں خالی زمین کا بے مصرف ٹکڑا کہیں نظر نہیں آیا۔ شہروں کی

For more books visit www.4Urdu.com

سڑکوں کے کناروں پر' دیہاتوں کے گلی کوچوں میں یا گھروں کے اندر یا باہر کسی کونے کھدرے میں جہاں بالشت دو بالشت خالی زمین نظر آئے' جاپانی فوراً وہاں پر موسمی پھول اور سبزی ترکاری بو دیتے ہیں۔ ہم نے ٹوکیو کے گنجان ترین علاقوں میں مکانوں اور دکانوں کی دہلیزوں کے کونوں اور کناروں میں اس طرح کی بے شمار لہلہاتی ہوئی کھیتیاں دیکھی ہیں۔

جاپان جانے سے پہلے ہم برما میں بھی چند روز کے لیے ٹھہرے تھے۔ واپسی پر پھر ایک روز وہاں پر رکے۔ اس وقت برما کے وزیراعظم مسٹر اونو تھے۔ وہ بدھ بھکشوؤں کی طرح ایک درویش سیرت انسان تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ہر سال کم از کم ایک ماہ کسی غار یا معبد میں معتکف ہو کر عبادت اور مراقبے میں بسر کرتے تھے۔ انہوں نے صدر ایوب سے پوچھا کہ ان کا جاپان کا دورہ کیسا رہا؟ صدر ایوب نے جاپانی قوم کی انتھک محنت' لگن اور ترقی کی خوب تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "جاپانی لوگ واقعی مشین کی طرح کام کرتے ہیں۔"

یہ سن کر مسٹر اونو کھلکھلا کر ہنسے اور بولے "بے چارے بدنصیب جاپانی۔ انسان کی عظمت انسان بننے میں ہے۔ مشین بننے میں نہیں۔"

وزیراعظم اونو نے قوموں کی مادی ترقی کے متعلق اپنا فلسفہ کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جس کا لب لباب یہ تھا یہ زمانہ مادی ترقی کا زمانہ ہے۔ رفتہ رفتہ مادی ترقی ساری دنیا کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لے گی جس طرح کہ برف' مٹی اور یخ کا تودہ پہاڑ کی چوٹی سے پھسلتا ہے۔ اگر کوئی ملک مادی ترقی سے بچنے کی کوشش کرے بھی تو وہ اس میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا' ہم سب مادی ترقی کی زد میں بے دست و پا مقید ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ترقی یافتہ ہو کر بھی انسان ہی رہیں۔ ایسی مشین نہ بن جائیں جس میں حرکت تو تیز ہو لیکن روح ندارد!

For more books visit www.4Urdu.com

## • ماں جی کی وفات

۲ مارچ ۱۹۶۲ء کو رات کے ساڑھے گیارہ بجے ماں جی جناح ہسپتال کے ایک کمرے میں اچانک ہم سے رخصت ہو گئیں۔ اس وقت میری جیب میں ریل گاڑی کے دو ٹکٹ تھے۔ کیونکہ اگلی صبح میں نے ان کو اپنے ہمراہ لے کر راولپنڈی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ لیکن انہوں نے یکایک اپنا ارادہ بدل لیا' اور اکیلے ہی اکیلے سفر آخرت پر روانہ ہو گئیں۔

URDU4U.COM

ماں جی کو کراچی کے قبرستان میں چھوڑ کر جب میں تنہا راولپنڈی واپس پہنچا۔ تو معاً یوں محسوس ہوا کہ گھر کی چھت اڑ گئی ہے اور اب دھوپ' بارش اولے اور آندھی سے بچنے کا کوئی حفاظتی سہارا موجود نہیں رہا۔ ایوان صدر میں اپنے دفتر گیا تو وہ بھی اجڑا اجڑا سا نظر آیا۔ کئی روز تک میرے سامنے میز پر فائلوں کا پلندہ جمع ہوتا رہا اور میں دیر دیر تک اس ڈھیر پر سر ٹکائے بے حس و حرکت بیٹھا رہتا تھا۔ چند بار سب سے اوپر والی فائل بھیگ جاتی تھی۔ جسے میرا اردلی عرفان باہر دھوپ میں رکھ کر سکھا لاتا تھا۔

ایک روز نہ جانے دل میں کیا ابال اٹھا کہ فائلیں میز پر جمع ہوتی رہیں۔ اور میں ایک کاغذ پر سر جھکائے بے ساختہ "ماں جی" کے عنوان پر ان کے بارے میں لکھتا رہا۔ لکھتے لکھتے آنکھوں سے بار بار آنسو ٹپ ٹپ کر کے گرتے تھے اور کاغذ پر تحریر شدہ الفاظ کو بھگو کر لکیروں کی صورت میں پھیلا دیتے تھے۔ میرے اردلی نے بتایا کہ اس دوران صدر ایوب کوئی بات کرنے بذات خود میرے کمرے میں تشریف لائے تھے۔ انہوں نے مجھے کاغذ پر جھکے ہوئے آنسو بہاتے دیکھا۔ تو بغیر کچھ کہے سنے چپ چاپ واپس چلے گئے۔ دو تین گھنٹے میں میری تحریر مکمل ہو گئی اور دل پھول کی پتی کی طرح ہلکا ہو گیا۔ صدر کے ملاحظہ کے لیے میں نے جلدی جلدی چند فائلیں تیار کیں۔ اور انہیں لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ ان کی میز پر فائلوں والی ٹرے خالی پڑی تھی اور

For more books visit www.4Urdu.com

وہ کرسی میں نیم دراز سے ہو کر کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ میری فائلوں کو انہوں نے خاموشی سے دیکھا اور ان سب پر مناسب احکامات درج کر کے مجھے لوٹا دیں۔ جب میں اٹھ کر باہر آنے لگا' تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے واپس بٹھا لیا۔ چند لمحے مکمل خاموشی طاری رہی پھر وہ نہایت نرم اور ہمدردانہ لہجے میں بولے۔ "مجھے احساس ہے کہ تمہارا زخم ابھی ہرا ہے۔ میری مانو تو چند روز کے لیے سوات ہو آؤ۔ تم اورنگ زیب اور اس کے والد کو اچھی طرح جانتے ہو۔ خوش مزاج اور زندہ دل لوگ ہیں۔ میں انہیں ٹیلیفون کر دونگا۔ شاید تمہارا غم کسی قدر ہلکا ہو جائے۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کر کے کہا۔ "سر' آج ایک خاص بات تھی۔ وہ پوری ہو گئی ہے۔ اب میں بالکل نارمل ہوں۔"

"ایسی کیا خاص بات تھی؟ کچھ ہمیں بھی اعتماد میں لو۔" وہ نرمی سے بولے۔ میں نے کسی قدر ہچکچاہٹ سے جواب دیا۔ "سر' میں نے اپنی ماں کی یاد کو الفاظ میں ڈھال کر کاغذ پر منتقل کر دیا ہے۔ اب یہ المیہ صرف میرا ہی غم نہیں رہا۔"

"کہاں چھپواؤ گے؟ انہوں نے پوچھا۔

"کسی رسالے میں۔ غالباً نقوش میں۔" میں نے جواب دیا۔

"جب چھپ جائے تو مجھے بھی پڑھنے کے لیے دینا۔" انہوں نے فرمائش کی

کچھ عرصہ بعد جب "ماں جی" نقوش میں شائع ہوئی۔ تو میں نے رسالہ کی ایک جلد صدر ایوب کی خدمت میں بھی پیش کر دی۔ معلوم نہیں انہوں نے اسے کبھی پڑھا بھی یا نہیں۔

البتہ بہت سے دوسرے لوگوں نے اسے شوق سے پڑھا۔ اور عرصہ تک مجھے نہایت اچھے اچھے خط آتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد جب ابن انشاء نے "نفسانے" کے منتخب افسانوں کو شامل کر کے میری تحریروں کے ساتھ "ماں جی" نام کی کتاب شائع کروائی۔ تو اب بھی وقتاً فوقتاً کچھ قارئین مجھے بڑے حوصلہ افزا خط لکھتے رہتے ہیں۔

For more books visit www.4Urdu.com

"ماں جی" پر اردو کے نامور افسانہ نگار' ڈرامہ نویس' ناولسٹ' نقاد اور دانشور میرزا ادیب کا تبصرہ بھی جو "نقوش" کے سالنامہ (جون ۱۹۸۵ء) میں شائع ہوا تھا' یہاں پر شامل کر رہا ہوں۔

URDU4U.COM

میری طرح کے جز وقتی نیم ادیب کے لیے یہ تبصرہ بڑا قیمتی اور باعث صد افتخار ہے۔ یہی احساس اسے یہاں پر نقل کرنے کے لیے میرے لیے وجہ ترغیب ہے یہ خود ستائی کی بات نہیں بلکہ جذبہ تشکر کا اظہار ہے۔

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

- ماں جی

## اردو ادب کا ایک زندہ کارنامہ

میرزا ادیب

اگر آپ قدرت اللہ شہاب کا نام لیتے ہیں اور آپ کے ذہن میں یہ نام لیتے ہی "ماں جی" کا تصور نہیں ابھرتا' تو یوں سمجھئے کہ آپ نے شہاب کا پورا نام نہیں لیا۔ اسی طرح آپ "ماں جی" کا ذکر کرتے ہیں اور ایک برقی رو کی مانند شہاب کا نام آپ کے دماغ میں در نہیں آتا۔ تو "ماں جی" کا ادھورا خیال آپ نے کیا ہے۔ اصل میں قدرت اللہ شہاب اور "ماں جی" اس طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئے ہیں کہ ایک نام دوسرے نام کے بغیر غیر مکمل لگتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں ان گنت ایسی تحریریں منظر عام پر آئی ہیں' جنہوں نے اپنے مصنفوں کو شہرت کے بلند سے بلند تر افق پر پہنچا دیا ہے' مگر ایسی تخلیقات بہت کم وجود پذیر ہوئی ہیں جو اپنے خالقوں کا ایک طرح سے جزو لاینفک بن گئی ہیں۔ جو اپنے خالقوں کو اپنے ساتھ لے کر چلی ہیں اور

For more books visit www.4Urdu.com

ہمیشہ ہم قدم رہی ہیں۔ ہم قدمی کا یہ انداز "ماں جی" اور قدرت اللہ شہاب کے ہاں موجود ہے۔

شہاب بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کی تعداد چالیس پینتالیس سے آگے نہیں بڑھتی' لیکن "ماں جی" لکھ کر تو انہوں نے ایک ایسا مقام حاصل کر لیا ہے جو گردش شام و سحر کے درمیان پہلے بھی بہت نمایاں تھا اور آج بھی اس کی اس قابل رشک حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس افسانے کو نہ جانے میں نے کتنی مرتبہ پڑھا ہے اور ہر بار اس کی پراسرار مقناطیسی کیفیت میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہے اور چھائی ہوئی ہے۔

"ماں جی" کا ایک حد تک تجزیاتی مطالعہ کرنے سے پیشتر شہاب کی دو ایک خصوصیات کا ذکر ضرور کروں گا۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ شہاب نے مختصر افسانے کے اساسی تقاضوں کو بہت اچھی طرح سمجھ کر ادب کی اس صنف کی طرف بھرپور توجہ کی ہے۔ ان کا افسانہ صحیح معنوں میں مختصر افسانہ ہوتا ہے۔ افسانے کی پوری تحریر میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا فقرہ ملے گا جو افسانے کی تعمیر میں اس حد تک اہم حصہ نہ لے کر اسے فالتو سمجھا جا سکے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں طنز کہیں تو واضح طور پر محسوس ہو جاتا ہے اور کہیں دبا دبا رہتا ہے۔ طنز کا جو رنگ شہاب میں ہے' اردو کے کسی بھی افسانہ نگار کے ہاں نہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد نے شہاب کو اردو کا سب سے بڑا طنز نگار افسانہ نگار کہا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

آیئے اب شہاب کے اس افسانے کی طرف توجہ کرتے ہیں جس کا عنوان "ماں جی" ہے اور جسے میں نے شہاب کا جزو لاینفک قرار دیا ہے۔ ماں کا اولین فقرہ یہ ہے:

"ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہو سکا۔"

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال کیونکر معلوم ہو سکتا تھا۔ صحیح سن ولادت تو اس شخص کا معلوم ہو سکتا ہے جس کا تعلق دوران وقت سے ہو۔ جو ہستی زمان و مکان کے حدود

For more books visit www.4Urdu.com

سے ماورا ہو اسے وقت کے پیمانے سے کیسے ناپا جا سکتا ہے؟ "ماں جی" ایک ہستی' ایک فرد' ایک شخصیت کی بجائے' آفاقی مامتا' کا تصور دیتی ہے۔ ایک ازلی اور ابدی وجود (Motherhood Universal) شہاب نے یہ الفاظ جب لکھے تھے' تو ان کے ذہن میں یہ تصور نہیں ہو گا' جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ مگر کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ہم غیر شعوری طور پر کچھ ایسے الفاظ لکھ جاتے ہیں جن کی اپنی کئی پرتیں ہوتی ہیں۔ شہاب نے ایک عام مفہوم کے لیے یہ فقرہ لکھا ہے۔ مقصود ان کا اپنی والدہ کے سن پیدائش سے ہے جو انہیں معلوم نہیں' لیکن یہ فقرہ لکھتے وقت انہیں یہ احساس نہیں ہو گا کہ وہ ایک خاص ماں کا ذکر نہیں کریں گے بلکہ حقیقتاً اس روح کا کریں گے جو ہر ماں کے اندر کار فرما ہے۔ جو آفاقی ہے اور جسے عام مفہوم میں "ممتا" یا مامتا کہا جاتا ہے۔

"ماں جی" نے دنیا میں آنے کے بعد ایک ایسے ماحول میں اپنی طفولیت کا دور گزارا ہے جو حد درجہ معصوم ہے۔ ان کے والد کے پاس چند ایکڑ زمین تھی' جو نہر کی کھدائی میں ختم ہو گئی تھی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیئے جاتے تھے۔ یہ بزرگ معاوضہ لینے کے ڈھنگ سے واقف ہی نہیں تھے۔ نتیجہ یہ کہ معاوضہ حاصل کرنے کی بجائے خود نہر کی کھدائی میں محنت مزدوری کرنے لگے۔

تو یہ ماں جی کے والد تھے۔

اب دیکھئے جو لڑکی ایسے باپ کے زیر تربیت اپنے شب و روز گزارے گی وہ قدرتاً کس سانچے میں ڈھل جائے گی۔ اسے دنیا داری کی کیا خبر ہو گی؟ اس کے باطن میں اول تو وہ امنگیں پیدا ہی نہیں ہوں گی جو ایک سوجھ بوجھ اور زمانے کے نشیب و فراز کو سمجھنے والی ہستی میں پیدا ہو سکتی ہیں اور اگر پیدا ہوں گی بھی تو صبر و شکر کے گہرے احساس میں مدغم ہو جائیں گی۔

"ماں جی" کا سفر بڑی سادگی کے عالم میں شروع ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے شاداب راستوں پر سفر نہیں کرتیں۔ ان راہوں پر قدم اٹھاتی ہیں جن پر کہیں کہیں سایہ دار درخت

For more books visit www.4Urdu.com

مسافر کو تیز دھوپ سے بچا لیتے ہیں۔ بس وہ اسی کو زندگی کا انعام سمجھ لیتی ہیں اور کبھی بھی حرف شکایت لب پر نہیں لاتیں۔ ان کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ بقر عید کا تہوار آتا ہے تو ان کے والد انہیں تین آنے بطور عیدی کے دے دیتے ہیں۔ یہ تین آنے اتنی بڑی رقم تھی کہ اس کا مصرف ہی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

URDU4U.COM

یہ تین آنے ان کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہتے ہیں۔ پھر ایک روز وہ گیارہ پیسوں کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیتی ہیں اور ایک پیسہ اپنے پاس محفوظ رکھتی ہیں۔

اس کے بعد جب کبھی ان کے پاس گیارہ پیسے جمع ہو جاتے ہیں' تو کسی مسجد کے دیے میں تیل ڈالنے کا انتظام کر لیتی ہیں' اس کے علاوہ ان گیارہ پیسوں کا کوئی مصرف وہ نہیں جانتیں۔ "ماں جی" کی اس حرکت یا طریق عمل کو محض ایک رسمی اور روایتی کہا جائے گا مگر ایسا نہیں ہے۔ شہاب نے ماں جی کی اس عادت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"ساری عمر جمعرات کی شام کو اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی' لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انہیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی "ماں جی" کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لیے جمع کر رکھے تھے۔ چونکہ وہ جمعرات کی شب تھی۔"

شہاب کے اس افسانے کا ایک ایک فقرہ بڑا بلیغ اور پر معنی ہے۔ مگر یہ پیرا جو میں نے نقل کیا ہے' اس اعتبار سے بے حد اہم ہے کہ اس کے ذریعے "ماں جی" کا پورا کردار واضح ہو جاتا ہے۔

میں نے ماں جی کے کردار پر غور کیا ہے تو یہ باتیں میری سمجھ میں آئی ہیں۔

تمہیدی سطور میں عرض کر چکا ہوں کہ "ماں جی" ایک فرد واحد تو ضرور ہیں مگر ان

For more books visit www.4Urdu.com

کا کردار فرد واحد سے زیادہ اس جذبے کی تجسیمی صورت ہے جو مامتا کہلاتا ہے۔ خدائے رحیم و رحمٰن نے نزول رحمت کی خاطر بے شمار ذرائع اختیار کئے ہیں لیکن ان ذرائع میں سب سے موثر' سب سے قوی اور ہمہ گیر اور آفاق گیر ذریعہ مامتا ہے۔ پیدا کرنے والے نے مامتا کو اپنی رحمت کا مظہر بنا کر اس خاکدان تیرہ و تاریک میں بھیجا ہے۔ رحمتوں کی ایک صورت ضیا افروزی ہے اور "ماں جی" کا یہ عمل جس کی وساطت سے وہ اندھیروں میں روشنی پھیلاتی ہیں۔ نزول رحمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ان کے عمل سے روشنی پھیلتی ہے اور روشنی رحمت و برکت کا دوسرا نام ہے۔

روشنی وہیں پھیلائی جاتی ہے' جہاں تاریکی ہو۔ ماں جی جہاں بھی رہتی ہیں تاریک گوشوں کو ڈھونڈتی رہتی ہیں کہ وہاں جا کر روشنی بکھیریں۔ یہ عمل ہنگامی نہیں' عارضی نہیں' مستقل ہے۔ خدا کی رحمت جب مستقل ہے تو دنیا میں اس کی رحمت کا مظہر عارضی کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہاں ایک اور بات کا بھی خیال رہے۔ ماں جی کی اس روشنی کا تعلق مسجدوں سے ہے۔ مسجدوں کے حوالے سے یہ روشنی جو ان کے دم قدم سے ظہور پذیر ہوتی ہے' ایک قسم کا تقدس حاصل کر لیتی ہے۔

رحمت کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ خود کو چند افراد' چند خاندانوں' چند لوگوں تک محدود نہیں کرتی۔ کیا سورج جب طلوع ہوتا ہے تو وہ اپنی کرنوں کو پھیلانے کے لیے رنگ' نسل' امارت' غربت وغیرہ کا امتیاز روا رکھتا ہے۔ کیا یہ کرنیں سیاہ فام نسل انسانی کو اپنا نور دینے سے انکار کر دیتی ہیں۔ کیا یہ کرنیں اونچے مکانوں کے ارد گرد ہی اپنا دامن پھیلا دیتی ہیں۔ غریبوں کی جھونپڑیوں کی طرف نہیں جاتیں؟

ماں جی تو سب کے لیے ہیں۔ رحمت خداوندی کی طرح۔ وہ سب کا بھلا چاہتی ہیں۔ ان کی دعا ہے "سب کا بھلا"

ماں جی کو ایک بالکل مختلف خاتون کی حیثیت سے شہاب نے پیش کیا ہے۔ ایک تو وہ زمانہ تھا کہ "ماں جی" اور ان کا خاندان بمشکل اپنا پیٹ بھر سکتا تھا۔ روکھی سوکھی کھا کر سب سو جاتے تھے یا محنت مزدوری کرنے لگتے تھے مگر ماں جی کے شوہر جب گلگت

For more books visit www.4Urdu.com

کے گورنر بنے تو ان کی بڑی شان و شوکت تھی۔ خوبصورت بنگلہ' وسیع باغ' نوکر چاکر' دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ۔ لیکن ماں جی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس سارے جاہ و جلال نے ان کی طبیعت میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ وہ ویسی کی ویسی رہی۔ بالکل سادہ' درویش منش خاکسار۔ اگر وہ کوئی عام عورت ہوتیں' تو ان کے خیالات بدل جاتے۔ مگر وہ تو سب کی طرح ہونے کے باوجود سب سے مختلف تھیں۔

کیا وہ سچ مچ ایک آئیڈیل ہستی تھیں؟ عام انسانوں سے ماورا' محض ایک زندہ' متحرک نصب العین۔

ماں جی میں ہزار دو ہزار خوبیاں موجود ہیں مگر شہاب اس گہری حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ انسان دیوتا کی عزت کرتا ہے۔ اس کی عظمت کا تہ دل و جان اعتراف کرتا ہے۔ مگر اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ پیار نہیں کر سکتا۔ پیار وہ انسان ہی سے کرے گا۔ شہاب کا یہ انتہائی خوب صورت کردار بڑا اونچا' بڑا مختلف کردار ہے۔ لیکن اپنی ساری خوبیوں' اپنی ساری بلندی کے باوصف وہ آخر ایک انسان ہی رہتا ہے۔

ایک بار "ماں جی" رشک و حسد کی اس آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں' جو ہر عورت کا ازلی ورثہ ہے۔ گلگت میں ہر قسم کے احکامات "گورنری" کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا۔

"بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں' لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے' خواہ مخواہ"

عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے' رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا۔ "بھاگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے۔ گورنری تو دراصل تمہاری سوکن ہے۔ جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔"

یہ سن کر ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگیں۔ آخر ایک عورت تھیں۔ سوکن کا جلاپا مشہور ہے۔ اگر وہ اس مقام پر وسعت قلب کا مظاہرہ کرتیں' تو وہ شاید اس سے زیادہ عظیم کردار بن جاتیں۔ مگر انسانی دنیا سے الگ

For more books visit www.4Urdu.com

تھلگ ہو جاتیں۔ ہمارے دلوں میں ان کے لیے صرف عظمت ہوتی' صرف احترام ہوتا۔ وہ پیار نہ ہوتا' جو ہم ان سے کرتے ہیں' وہ محبت نہ ہوتی جو انہیں انسانوں کی اس دنیا میں حاصل ہے کیونکہ ایک کردار کی صرف عزت کرنے کے لیے اس کی ملکوتی صفات کی ضرورت ہوتی ہے اور جب اس کی عزت بھی کی جائے' اس سے پیار بھی کیا جائے' اس سے محبت بھی کی جائے تو یہ اس کی انسانی صفات کی وجہ سے ہوتا ہے۔

شہاب کا ناقابل فراموش کردار "ماں جی" جہاں اپنے اندر ملکوتی صفات رکھتا ہے' وہاں انسانی صفات سے بھی محروم نہیں ہے۔ ملکوتی اور انسانی صفات اسے عظیم اور پیارا کردار بنا دیتی ہیں۔ میں نے اوپر بتایا ہے کہ طنز نگاری کا جو جوہر شہاب میں ہے۔ وہ اردو کے بہت ہی کم نثر نگاروں کے حصے میں آیا ہے۔ ان کے یہاں طنز کی کاٹ بڑی گہری ہوتی ہے۔ اس پورے افسانے پر سنجیدگی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ مگر شہاب کا قلم یہاں بھی طنز کا رنگ جما دیتا ہے۔

"ماں جی" دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں اور اب شہاب کا مسئلہ ان کے اپنے الفاظ میں سنئے۔

اگر "ماں جی" کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے زیادہ کی ہمت نہیں ہوتی لیکن مسجد کا ملا پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔ ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے۔ لیکن کھانے والا درویش کہلاتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

آخر میں میں ایک فقرہ لکھنا چاہتا ہوں' شاید اسے ایک رسمی فقرہ گردانا جائے مگر میں اپنی طرف سے ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں' مجھے یقین ہے کہ اگر شہاب صرف یہی ایک افسانہ لکھ کر قلم ہاتھ سے رکھ دیتے تو بھی وہ ادب کی تاریخ میں زندہ رہتے۔ فقط اس افسانے کی بدولت' یہ افسانہ زندہ رہنے والی تخلیقات میں سے ہے' تو پھر اس تخلیق کا خالق کیوں کر فراموش کیا جا سکتا ہے؟

For more books visit www.4Urdu.com

شہاب نے اس افسانے میں ایسی نثر کا نمونہ دیا ہے جسے میں شعری اصطلاح میں سہل ممتنع کہہ سکتا ہوں۔ ایسی نثر لکھنے کی ہزار کوشش کرو' نہیں لکھی جائے گی۔ وہ شاعری نہیں کرتے مگر ان کی اس نثر میں شاعری موجود ہے۔ ایسی روانی جیسے ہم اقبال کا "ساقی نامہ" پڑھ رہے ہیں۔

"پرچہ لگا" کی ترکیب یا تو محمد حسین آزاد کے ہاں پڑھی تھی یا شہاب کے ہاں پڑھ رہے ہیں۔ یہ ترکیب انہوں نے اس طرح استعمال کی ہے۔ انہی دنوں پرچہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے۔

کتنا سبک فقرہ ہے۔ "پرچہ" کی جگہ اطلاع لفظ رکھئے فقرے کی ساری خوبصورتی پامال ہو کر رہ جائے گی۔

"ماں جی! آپ کی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟" ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر ان سے پوچھا کرتے۔

"توبہ توبہ پت" ماں جی کانوں کو ہاتھ لگاتیں۔

اس "توبہ توبہ پت" کا جواب نہیں ہے۔

یہ افسانہ پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں ایک سوال آیا تھا۔ ممکن ہے کسی اور قاری کے ذہن میں بھی یہ سوال آیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ شہاب نے "ماں جی" کے کردار کو تو بہت خوش اسلوبی سے بنایا سنوارا ہے۔ اپنے باپ کے کردار کی طرف توجہ کیوں نہیں کی۔ وہ انہیں افسانے میں جہاں کہیں ان کا ذکر آتا ہے "عبداللہ صاحب" کہتے ہیں۔

میں عرض کروں گا کہ "ماں جی" کے کردار میں جیسا کہ میں نے کہا ہے' شہاب نے "یونیورسل مدرہوڈ" یا ان کے آفاقی جذبے کی تجسیم کی ہے۔ باپ کے معاملہ میں ان کے پیش نظر کوئی ایسی چیز نہیں تھی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ ان کے والد مکرم کا کردار بھی اپنی جگہ ایک منفرد کردار محسوس ہوتا ہے۔

سرسید احمد خاں عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلواتے ہیں کہ انگلستاں میں جا کر آئی

For more books visit www.4Urdu.com

سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔ مگر عبداللہ صاحب کی والدہ بیٹے کو انگلستان جانے سے روک دیتی ہیں۔

عبداللہ صاحب وظیفہ واپس کر دیتے ہیں' سرسید سخت خفا ہو کر پوچھتے ہیں۔ "کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو۔"

URDU4U.COM

"جی ہاں" عبداللہ صاحب جواب دیتے ہیں۔

کیا یہ اس کردار کی انفرادیت نہیں ہے۔ مگر اس افسانے کا مرکزی کردار "ماں جی" ہی ہے۔ "ماں جی" جو سدا بہار کردار ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والا کردار ہے۔

(بہ شکریہ "نقوش" لاہور)

○○○

For more books visit www.4Urdu.com

## • صدر ایوب کا زوال

صدر ایوب کے زوال کے اسباب مفرد نہیں بلکہ مرکب تھے۔ ان کے اقتدار کے عصا کو ۱۹۶۹ء سے برسوں پہلے زوال کی دیمک نے اندر ہی اندر چاٹنا شروع کر دیا تھا لیکن حکمرانی کی ترنگ میں انہوں نے کبھی اسے محسوس نہ کیا۔

URDU4U.COM

صاحب اقتدار کا زوال سب سے پہلے اس کے اپنے اندر شروع ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ صدر ایوب کی نیت کو گھن لگنا کس وقت شروع ہوا۔ (اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ان کی نیت میں ابتدا ہی سے کوئی فتور تھا) نیتوں کا اندازہ قرائنی شہادت ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ فروری ۱۹۶۲ء میں ایک صاحب مدراس (بھارت) سے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں گزارنے سعودی عرب جا رہے تھے۔ ایک برس سے ان کے بہت سے خطوط مدراس سے آ چکے تھے کہ پاکستان میں چند روز قیام کے دوران وہ صدر ایوب سے ضرور ملنا چاہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ علم جعفر کے بہت بڑے ماہر ہیں اور ایوب خاں کو چند اہم پیشین گوئیاں سنانا چاہتے ہیں۔ صدر کے ساتھ ان کی نصف گھنٹہ کی ملاقات بڑا صبر آزما مرحلہ تھی۔ کیونکہ ان صاحب کی عمر سو برس سے اوپر تھی۔ ضعیف العمری اور لکنت کے علاوہ وہ بہت اونچا سنتے تھے۔ ان کی گفتگو بھی کافی حد تک بے سروپا تھی۔ لیکن ایک بات جو ہمارے پلے پڑی' وہ یہ تھی کہ ان کے علم جعفر کی رو سے صدر ایوب پاکستان پر آٹھ یا نو برس تک حکومت کریں گے۔

جب وہ صاحب چلے گئے تو صدر ایوب نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "یہ بڈھا کیا بک رہا تھا کہ میں آٹھ یا نو برس حکومت کروں گا۔ کیا اس کے علم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ نیا آئین نافذ ہو رہا ہے جس میں میری صدارت کی معیاد فقط دو سال اور ہے۔ اس کے بعد نئی اسمبلیاں ہوں گی اور نئے ووٹر ہوں گے۔ شاید وہ صدر بھی نیا منتخب کرنا

For more books visit www.4Urdu.com

چاہیں۔

میرا اندازہ ہے کہ اس وقت یہ ان کی ایماندارانہ رائے تھی جو سراسر نیک نیتی پر مبنی تھی۔ لیکن اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کا رخ بدل گیا۔ اور نیک نیتی کا سارا بھرم نفسانی خواہشات' آئینی ترمیمات اور سیاسی ریشہ دوانیوں کی نذر ہو گیا۔ اس انحطاطی عمل کا آغاز بظاہر مئی ۱۹۶۴ء میں شروع ہوا۔ جب صدر ایوب نے قومی اسمبلی میں اپنے آئین میں دوسری ترمیم منظور کروانے کے لیے سر توڑ کوشش شروع کر دی۔ آئین کی رو سے صدر کے انتخاب سے پہلے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات مکمل ہونا لازمی تھے لیکن اب صدر ایوب کی نیت بدل گئی۔ ان کے ایماء پر اس بندوبست کو الٹ کرنے کے لیے جو آئینی ترمیم پیش کی گئی' اس کے خلاف قومی اسمبلی میں شدید رد عمل ہوا۔ ترمیم منظور کرنے کے لیے اسمبلی میں مطلوبہ ووٹوں کی تعداد حاصل کرنا دشوار ہو گئی' تو حکومت نے دھونس' دھاندلی' لالچ اور فریب سے کام لے کر حزب مخالف کے آٹھ اراکین کو توڑ لیا۔ اس سے قبل صدر ایوب نے بڑے اہتمام سے پولٹیکل پارٹیز ایکٹ میں یہ شرط رکھوائی تھی کہ اگر قومی یا صوبائی اسمبلی کا کوئی ممبر اپنی پارٹی چھوڑے گا تو اسے اسمبلی کی نشست سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا اور اس نشست کے لیے اسے از سر نو انتخاب لڑنا ہو گا۔ لیکن قومی اسمبلی کے آٹھ بھگوڑے ممبروں کے خلاف ایسی کوئی کارروائی عمل میں نہ لائی گئی بلکہ ان میں سے ایک کو تو بعد ازاں ہائیکورٹ کا جج بھی بنا دیا گیا۔ دوسرے سات ممبروں کو کیا انعام دیا گیا' اس کا مجھے علم نہیں۔

چنانچہ اس ترمیم کے ذریعہ اب یہ قرار پایا کہ نیا صدر منتخب ہونے تک موجودہ صدر بدستور عنان اقتدار میں رکھے گا۔ اور صدر کا انتخاب مرکزی اور صوبائی اسمبلوں کے انتخابات سے قبل عمل میں لایا جائے گا۔ بلا شبہ ان آئینی تبدیلیوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ اگلے انتخاب میں صدر ایوب کا پلہ بھاری رہے۔ صدارتی انتخاب میں دھاندلی کی راہ ہموار کرنے کے لیے آئین کی یہ توڑ مروڑ عوام کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی۔ اور صدر ایوب کے اپنے بنائے ہوئے آئین کی ان کے اپنے ہاتھوں پامالی نے ان کی ذات

For more books visit www.4Urdu.com

پر بھرم اور بھروسے کا گراف کئی درجہ نیچے گرا دیا۔

اس ترمیم کے جلو میں اسی برس یکے بعد دیگرے دو مزید آئینی ترامیم بھی معرض وجود میں آئیں۔ ایک کے ذریعے دیہاتی سطح پر نمبرداروں' انعام داروں' سفید پوشوں اور ذیلداروں کو بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات لڑنے کا اہل قرار دے دیا گیا تا کہ حکومت کے اپنے کارندے اور حلقہ بگوش زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان اداروں میں شامل ہو سکیں۔ دوسری ترمیم سے سرکاری ملازمین کی معیاد ملازمت اور سبکدوشی کے نئے قواعد و ضوابط نافذ ہو گئے اور حکومت کی گرفت ان کی شہ رگ پر براہ راست اور بھی مضبوط ہو گئی۔ ان اقدامات سے ان شکوک و شبہات کو مزید تقویت ملی کہ صدر ایوب سیاست کے علاوہ نظم و نسق کے ہر شعبے میں بھی طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر کے اگلا صدارتی انتخاب ہر قیمت پر جیتنے کا جال بچھا رہے ہیں۔

ان آئینی ترامیم کے ساتھ ہی صدر کے عہدہ کے لیے انتخابی مہم پورے زور و شور سے شروع ہو گئی۔ ملک کے بہت سے سربر آوردہ صدر ایوب کی مخالفت کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ ان میں خواجہ ناظم الدین' میاں ممتاز دولتانہ' شیخ مجیب الرحمٰن' مولانا بھاشانی' خان عبدالولی خان' چوہدری محمد علی اور مولانا مودودی کے نام سر فہرست تھے۔ ان رہنماؤں کی قیادت میں کونسل مسلم لیگ' عوامی لیگ' نیشنل عوامی پارٹی' نظام اسلام پارٹی اور جماعت اسلامی کے اتحاد سے "کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز" کی تنظیم قائم ہوئی۔ جس کا واحد مقصد صدر ایوب کو صدارتی انتخابات میں شکست دینا تھی۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی اور مشترکہ لائحہ عمل یا منشور نہ تھا۔

اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے یہ لازمی تھا کہ یہ متحدہ محاذ ایک ایسا صدارتی امیدوار نامزد کرے جو ایوب خاں کو شکست دینے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ان کے سامنے ایک نام تو مس فاطمہ جناح کا تھا جو قائداعظم کی بہن ہونے کے ناطے سے ملک بھر میں ایک خاص عزت و احترام اور جذباتی قدر و منزلت کی حامل تھیں۔ دوسرا امکان جنرل محمد اعظم

For more books visit www.4Urdu.com

خاں کے نام کا تھا۔ گورنر کے طور پر وہ مشرقی پاکستان میں نمایاں ہر دلعزیزی حاصل کر چکے تھے۔ اور وزیر مہاجرین و بحالیات کی حیثیت سے وہ مغربی پاکستان میں بھی خاصے نیک نام تھے۔ مس جناح کی جگہ اگر جنرل اعظم کو صدارتی امیدوار نامزد کیا جاتا تو یقیناً صدر ایوب کو بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا لیکن وزیر خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے اس موقع پر ایک عجیب ترپ کی چال چلی۔ نیشنل عوامی پارٹی کے ایک ممتاز رکن مسٹر مسیح الرحمٰن سے ان کا گہرا یارانہ تھا۔ مسیح الرحمٰن بھٹو صاحب کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کے علاوہ مولانا بھاشانی کے دست راست بھی تھے۔ ذاتی طور پر وہ اچھی شہرت کے مالک نہ تھے۔ اور سیاست میں مول تول کرنے کے اسرار و رموز سے واقف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مسٹر بھٹو نے انہیں پانچ لاکھ روپے کے عوض خرید لیا۔ بعض ذرائع تو اس پانچ لاکھ روپے کی بانٹ میں مولانا بھاشانی کو بھی شراکت کا حصہ دار ٹھہراتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسیح الرحمٰن کے داؤ پیچ میں آ کر مولانا بھاشانی نے کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز پر شرط عائد کر دی کہ وہ صرف ایسی شخصیت کو صدارتی امیدوار نامزد کریں جس کا مارشل لاء کی حکومت سے کبھی کوئی تعلق نہ رہا ہو۔ جنرل اعظم خاں مارشل لاء کی حکومت کا ایک نہایت اہم رکن رہ چکے تھے اس لیے یہ شرط عائد ہونے کے بعد صدارتی امیدوار کی حیثیت سے ان کا نام خود بخود خارج از بحث ہو گیا۔

اسی طرح کا پیچ دار حربہ استعمال کر کے صدارتی انتخابات کے سلسلے میں مسٹر بھٹو نے صدر ایوب کی ایک اور اہم خدمت بھی سر انجام دی تھی۔ چند قانونی ماہرین کے مشورے سے کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز نے یہ خفیہ فیصلہ کیا کہ ایوب خاں کی صدارتی امیدوار کی حیثیت کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جائے کیونکہ فیلڈ مارشل کے طور پر ان کی تقرری کے جو احکام جاری ہوئے تھے ان کے پیش نظر وہ آئینی طور پر کسی انتخاب میں حصہ لینے کے اہل نہیں رہے۔ اپنی قیمت وصول کر کے مسیح الرحمٰن نے متحدہ محاذ کا یہ راز

For more books visit www.4Urdu.com

درون خانہ بھی مسٹر بھٹو پر فاش کر دیا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر صدر ایوب نے فوراً اپنی تقرری کے احکامات میں موثر بر ماضی رد و بدل کر کے انہیں آئینی تقاضوں کے ہم آہنگ کر لیا۔

URDU4U.COM

صدر ایوب اپنے انتخاب کی راہ میں ہر رکاوٹ کو دور کرنا اپنا حق سمجھنے لگے تھے۔ اس عمل میں ان کے نزدیک جائز یا ناجائز طریق کار کی کوئی تمیز باقی نہ رہی تھی۔ میرے خیال میں زوال کی طرف یہ ان کا ایک یقینی قدم تھا۔

صدارتی الیکشن کے دوران صدر ایوب نے دین اور دنیا دونوں سے بے دریغ فائدہ اٹھایا۔ پہلے تو ایک مشہور پیر صاحب نے اعلان فرما دیا کہ انہیں بذریعہ کشف یہ الہام ہوا ہے کہ کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل نہیں۔ اس کے بعد چند علمائے کرام نے یہ فتویٰ بھی صادر کر دیا کہ اسلام کی رو سے کسی عورت کا سربراہ مملکت کے عہدے پر فائز ہونا جائز نہیں۔ اس مسئلہ پر جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی کی یہ رائے تھی کہ اسلام میں عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی اجازت تو ہے لیکن مناسب نہیں۔ صدر ایوب کے حواریوں نے مس فاطمہ جناح کو نیچا دکھانے کے لیے حسب توفیق اسلام کا ہر ممکن استعمال یا استحصال کیا۔

صدارتی الیکشن کے دوران دین کے علاوہ دنیا بھی بے حساب کمائی اور لٹائی گئی۔ ایوب خاں کی کنونشن مسلم لیگ کے ہاتھ میں کروڑوں کا الیکشن فنڈ موجود تھا۔ اسے جمع کرنے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کئے گئے تھے۔ اکثر تاجروں اور صنعت کاروں کو امپورٹ لائسنسوں پر مقررہ شرح سے الیکشن فنڈ میں چندہ دینا ہوتا تھا۔ کچھ لائسنس فرضی ناموں پر جاری کر کے بھاری قیمت پر ضرورت مند تاجروں اور صنعت کاروں کے ہاتھ فروخت کر دیئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ پٹ سن کے کارخانوں اور سوتی اور اونی ٹیکسٹائل ملوں سے بھی بھاری بھر کم چندے وصول کئے گئے تھے۔ اس بہتی گنگا میں ہر کوئی ننگا اشنان کر رہا تھا اور بہت سے کارکن اپنا اپنا ہاتھ رنگنے میں نہایت بے حجابی سے سر عام مصروف تھے۔ صدر ایوب کے صدارتی انتخاب کی مہم میں پیسے کی ریل پیل نے

For more books visit www.4Urdu.com

سیاسی گلن اور سڑن کو ایسا فروغ بخشا جس کی مثال ہماری تاریخ میں پہلے نہیں ملتی۔ انہوں نے سیاست کی تطہیر کی خاطر پوری فوج کے ساتھ سیاستدانوں پر چڑھائی کی تھی۔ اور اب ان کی پارٹی خود ہی الیکشن کے تالاب میں گندی مچھلی کا روایتی کردار ادا کرنے میں سرگرم عمل تھی۔

الیکشن کے بعد ۳ جنوری ۱۹۶۵ء کو جب نتیجہ برآمد ہوا تو صدر ایوب کے حق میں ۴۹۶۴۷ ووٹ اور مس فاطمہ جناح کے حق میں ۲۸۳۴۵ ووٹوں کا اعلان ہوا۔ بظاہر ایوب خاں صاحب ۲۱۳۰۲ ووٹوں کی اکثریت سے جیت گئے تھے لیکن اس تعداد سے کئی گنا زیادہ عوام کی نظر میں دراصل وہ بازی ہار بیٹھے تھے۔ کیونکہ اب وہ اس طرح کا امیج لے کر نہیں ابھرے تھے جس کے ساتھ وہ پہلے پہل اقتدار میں آئے تھے۔

انتخاب میں ڈھاکہ اور کراچی نے بھاری اکثریت سے صدر ایوب کے خلاف ووٹ ڈالے تھے۔ ڈھاکہ کے متعلق تو وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ لیکن کراچی میں ان کے فرزند دلپذیر گوہر ایوب نے اہالیان شہر کی گوشمالی کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ ۵ جنوری کو جشن فتحیابی کے نام پر کراچی میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا گیا۔ جس کی قیادت گوہر ایوب کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے جلو میں سڑکوں' جیپوں' ویگنوں' بسوں اور رکشاؤں کی طویل قطار تھی۔ ان سب کے ڈرائیور اور سواریاں زیادہ تر پٹھانوں پر مشتمل تھیں۔ صدارتی الیکشن سے کئی ماہ قبل کراچی میں ضلع ہزارہ کے پٹھانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی اور جشن فتح یابی کے روز وہ شہر کی فضا پر ایک دہشتناک غبار کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ لیاقت آباد اور چند دوسرے علاقوں میں جلوس اور شہریوں کے درمیان کچھ جھڑپیں ہوئیں۔ اس کا بدلہ چکانے کے لیے رات کے اندھیرے میں ان بستیوں پر شدید حملے کئے گئے۔ آگ لگائی گئی اور کافی جانی اور مالی نقصان پہنچایا گیا۔ اس نقصان کا صحیح اندازہ کسی کو نہیں لیکن "شہیدان لیاقت آباد" کی یاد منانے کے لیے ہر سال ۵ جنوری کو ایک تقریب منائی جانے لگی۔ کئی روز تک کراچی میں خوف و ہراس طاری رہا۔ اور پٹھانوں اور مہاجرین

For more books visit www.4Urdu.com

کے درمیان شدید کشیدگی پیدا ہو گئی۔ کچھ راویوں کے مطابق اس زمانے میں ایک بار پھر ہندو مسلم فسادات کے واقعات کی یاد تازہ ہو گئی۔ صدارتی انتخاب جیتنے کے فوراً بعد

URDU4U.COM

یہ صورت حال صدر ایوب کے نئے دور حکومت کے لیے صریحاً ایک شدید بد شگونی کی علامت تھی۔

گندھارا انڈسٹریز کے بعد گوہر ایوب کا یہ دوسرا شگوفہ تھا جس نے صدر ایوب کی ساکھ پر بدنامی' بد سگالی' بد فالی اور نحوست کی گہری دھول اڑائی۔ اس کارنامے کے بعد اس فرزند دلپذیر نے مزید کل پرزے نکالنا شروع کئے جس سے بادی النظر میں یہ گمان گزرتا تھا کہ شاید صدر ایوب اس برخوردار کو اپنی ولی عہدی کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ کراچی کے نظم و نسق میں بڑی حد تک دخیل ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد جب انہیں کراچی مسلم لیگ کی رابطہ کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا گیا تو فی الفور یہ افواہ پھیل گئی کہ اس تقرری کے پردے میں اس نوجوان کو اگلا صدارتی انتخاب لڑنے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ کراچی میں ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جن کے دل میں گوہر ایوب کے خلاف غم و غصے کی آگ پہلے ہی سے سلگ رہی تھی۔ اس افواہ نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔ اس صورت حال کا علم نہ صدر ایوب کو تھا نہ گوہر ایوب کو۔ کیونکہ بیشتر سرکاری اور سیاسی ادارے ان دونوں کی خوشامد اور چاپلوسی میں لگے ہوئے تھے۔ اہالیان کراچی کی آشفتگی' برہمی اور جھلاہٹ کا بھانڈا اس وقت پھوٹا' جب رمضان المبارک کے پہلے جمعہ کے موقع پر گوہر ایوب نے کراچی کی میمن مسجد میں تقریر کرنے کی کوشش کی۔ اس پر مسجد میں زبردست ہنگامہ ہو گیا۔ لوگوں نے تقریر سننے سے صاف انکار کر دیا۔ کسی قدر ہاتھا پائی بھی ہوئی۔ اور گوہر ایوب کو بمشکل پولیس کی حفاظت میں مسجد سے باہر لایا گیا۔ اس احتجاجی واقعہ نے ایک طرف گوہر ایوب کی بڑھتی ہوئی توقعات اور خواہشات کی بساط الٹ دی۔ دوسری جانب صدر ایوب کے اقتدار کی سیڑھی کے پائیدان کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

For more books visit www.4Urdu.com

یوں بھی اقتدار کی سیڑھی کے اس پائیدان میں پہلے ہی سے بہت سی دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ میمن مسجد والے حادثہ سے تقریباً چار ماہ قبل کراچی میں ایک اور واقعہ بھی رونما ہو چکا تھا۔

URDU4U.COM

جولائی ۱۹۶۷ء میں مادر ملت مس فاطمہ جناح کی وفات پر کراچی میں لاکھوں شہری ان کے جنازے میں شامل ہوئے۔ جلوس کے ایک حصے نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ کچھ نعرے حکومت کے خلاف بلند ہوئے۔ کچھ نعروں میں "ایوب خاں مردہ باد" کہا گیا۔ اس پر پولیس کی مشینری حرکت میں آئی اور لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے علاوہ گولی بھی چلائی گئی۔ مرنے والوں کی صحیح تعداد مصدقہ طور پر کبھی متعین نہیں ہوئی لیکن خون کی جس قدر مقدار بھی اس موقع پر بہائی گئی بلا شبہ اس نے صدر ایوب کے زوال کی راہ ہموار کرنے میں بد نصیبی کا چھڑکاؤ کیا۔

کراچی کی میمن مسجد میں گوہر ایوب کو جو سانحہ پیش آیا تھا' اس کے بعد پے در پے بدفال واقعات کا ایسا تانتا بندھ گیا جس نے صدر ایوب کے راج سنگھاسن کو نہایت بری طرح ڈگمگا کے رکھ دیا۔ دسمبر ۱۹۶۷ء کے آخری حصے میں وہ مشرقی پاکستان کے دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ میں بھی اسی سلسلہ میں ڈھاکہ گیا ہوا تھا۔ یکایک خبر اڑی کہ صدر ایوب کو اغوا کر کے انہیں قتل کرنے کی سازش پکڑی گئی ہے۔ اس خبر کے پھیلتے ہی صدر کی ذاتی حفاظت کا انتظام کئی گنا زیادہ سخت کر دیا گیا اور ڈھاکہ میں ایوان صدر پر پولیس اور فوجی گارد بھی غیر معمولی طور پر بٹھا دی گئی۔

انہی دنوں صدر ایوب کے احکام پر میں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کی یونیورسٹیوں سے پولٹیکل سائنس کے بہت سے اساتذہ کو ڈھاکہ میں جمع کر رکھا تھا۔ کیونکہ صدر ان کے ساتھ قومی اتحاد اور سالمیت کے موضوع پر تبادلہ خیالات کرنے کے خواہشمند تھے۔ مقررہ وقت پر ہم سب ایوان صدر کے وسیع برآمدہ میں جمع ہو کر بیٹھ گئے۔ میں صدر کو بلانے کے لیے اندر گیا تو ڈرائنگ روم میں عجب سماں دیکھنے میں آیا۔ ایک صوفے پر صدر ایوب سراسیمگی کے عالم میں بیٹھے ہوئے گورنر عبدالمنعم خاں کے ساتھ سرگوشیاں

For more books visit www.4Urdu.com

کر رہے تھے۔ دوسری جانب چند وزرائے کرام ایک دوسرے کے ساتھ کانا پھوسیوں میں مصروف تھے۔ تیسری طرف فوج اور سول انٹیلی جنس کے دو تین اعلیٰ افسر اسی طرح سر سے سر جوڑے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی صدر ایوب نے کہا۔ "کیا یہ میٹنگ ملتوی نہیں کی جا سکتی؟"

میں نے جواب دیا کہ کئی پروفیسر صاحبان دور دراز مقامات سے آئے ہوئے ہیں اور آج شام یا کل صبح واپس جانے کے لیے بکنگ کروائے بیٹھے ہیں۔ اگر یہ میٹنگ آج نہ ہوئی تو انہیں مایوسی ہو گی۔

صدر ایوب نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں صرف چند منٹ کے لیے آ جاؤں گا۔ زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ہو گا۔ باقی بحث مباحثہ تم لوگ خود کرتے رہنا۔"

پولٹیکل سائنس کے پروفیسروں اور کچھ صحافیوں کی ملی جلی میٹنگ میں آ کر صدر نے مختصر طور پر چند اکھڑی اکھڑی سی باتیں کیں۔ اور پھر نہایت عجلت کے ساتھ گورنر عبدالمنعم خاں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گورنر ہاؤس روانہ ہو گئے۔

اسی رات گورنر ہاؤس میں صدر کے اعزاز میں ایک پر تکلف عشائیہ تھا۔ معمول کے مطابق مہمانوں کا ہجوم تھا لیکن سارے مجمع پر ایک پر اسرار سی مردنی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے ہوئے آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔

اپنی عادت کے خلاف صدر ایوب دو گھنٹے سے زیادہ تاخیر کے بعد دعوت میں تشریف لائے۔ اس وقت بھی ان کے چہرے پر کسی قدر تھکاوٹ اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ آج ہی اگرتلہ سازش کا راز ان پر فاش ہوا ہے اور وہ صبح سے شام تک اس سازش کی تفصیلات کا جائزہ لینے میں مصروف رہے ہیں۔

جنوری ۱۹۶۸ء کے اوائل میں اس سازش کا سرکاری طور پر اعلان کر دیا گیا۔ سازش میں شیخ مجیب الرحمٰن کے علاوہ ۲۸ دیگر افراد ملوث تھے۔ ان پر یہ الزام تھا کہ ڈھاکہ میں بھارتی سفارتی مشن کے فرسٹ سیکرٹری پی این اوجھا کے زیر اہتمام یہ لوگ ہندوستانی عناصر کے ساتھ مل کر مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کی سازش میں مصروف عمل تھے۔ اس

For more books visit www.4Urdu.com

مقصد کے لیے اگرتلہ (بھارت) میں ایک مرکز قائم کیا گیا تھا جہاں سے علیحدگی کی تحریک کو اسلحہ اور دوسرا تخریبی مواد فراہم کیا جاتا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن تو پہلے ہی مئی ۱۹۶۶ء سے اپنے چھ نکاتی پروگرام کی پاداش میں ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت جیل میں تھے۔ لیکن اب انہیں اگرتلہ سازش کیس میں ملزم کے طور پر از سر نو گرفتار گردانا گیا۔

اگرتلہ سازش کے مقدمہ کی سماعت کے لیے ایک خصوصی ٹریبونل قائم کیا گیا۔ جس کے سربراہ پاکستان کے ایک سابق چیف جسٹس مسٹر ایس اے رحمان تھے۔ سترہ برس قبل ۱۹۵۱ء میں بھی راولپنڈی سازش کیس کے لیے ایک خصوصی ٹریبونل قائم کیا گیا تھا۔ لیکن اس مقدمے کی سماعت کھلی عدالت میں نہیں بلکہ بہ صیغہ راز ہوئی تھی۔ اس کے برعکس اگرتلہ سازش کیس کی سماعت کھلی عدالت میں رکھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سماعت کے دوران مشرقی پاکستان کی علیحدگی اس کے الگ نام' پرچم اور قومی ترانے تک کی تفصیلات کھل کر بر سر عام آ گئیں۔ اور علیحدگی پسند عناصر کو اپنی جائز اور ناجائز شکایتوں کی تشہیر کا بھی ایک نادر موقع ہاتھ آ گیا۔ جس کر و فر سے یہ سب تفصیلات اخبارات میں اچھالی جاتی تھیں۔ اس کے دو پہلو تھے۔ ایک پہلو یہ تھا کہ مغربی پاکستان کے خلاف نفرت بڑھتی تھی اور صدر ایوب کی مرکزی حکومت پر اعتماد کمزور پڑ جاتا تھا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ علیحدگی کے جراثیم عوام کے ذہن میں جڑ پکڑتے گئے اور شیخ مجیب الرحمٰن کی قیادت کو بیٹھے بٹھائے انتہائی فروغ حاصل ہو گیا۔ بلا شبہ اگرتلہ سازش کا مقدمہ صحیح حقائق و شواہد پر مبنی تھا۔ لیکن جس طور پر اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ سے اس مقدمے کی پبلسٹی اور تشہیر ہوئی اس نے اس کے حقائق کو سیاسی اور عوامی ہیجان کی دلدل میں ملیا میٹ کر دیا۔ یہ ہیجان اس قدر شدید تھا کہ ایک روز ڈھاکہ کے ایک بے قابو ہجوم نے اس اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پر حملہ کر دیا جس میں اگرتیلہ سازش کیس ٹریبونل کے سربراہ جسٹس ایس اے رحمان قیام پذیر تھے۔ انہوں نے بمشکل تمام ایک

For more books visit www.4Urdu.com

وفادار بنگالی خدمت گار کی کوٹھڑی میں روپوش ہو کر اپنی جان بچائی۔ اور پھر چپکے چپکے پوشیدہ طور پر ہوائی جہاز میں بیٹھ کر لاہور واپس چلے آئے۔

URDU4U.COM

۲۹ جنوری ۱۹۶۸ء کے روز اردن کے شاہ حسین کراچی آئے ہوئے تھے۔ اسی شام راولپنڈی کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں ان کا عشائیہ تھا۔ صدر ایوب جب ہوٹل پہنچے تو ان کا رکھ رکھاؤ اور چہرہ مہرہ ان کے معمول کے حساب سے نارمل نظر نہ آتا تھا۔ دعوت کے ہال میں داخل ہونے سے پہلے وہ سیدھے بار (شراب خانہ) گئے اور ایک گلاس میں بہت سی وہسکی ڈلوا کر پانی یا سوڈا واٹر ملائے بغیر اسے ایک ہی سانس میں غٹ غٹ چڑھا گئے۔ اس کے بعد یہی عمل انہوں نے چند بار دہرایا۔ شراب وہ ضرور پیتے تھے لیکن اس طرح کھڑے کھڑے ندیدوں کی طرح نیٹ وہسکی کے گلاس پر گلاس چڑھانا ان کا دستور نہ تھا۔ ہوٹل کی بار میں اس طرح کئی گلاس پینے کے بعد ان کی آواز کس قدر خمار آلود ہو گئی۔ کھانے کے بعد جب وہ پہلے سے تیار کردہ لکھی ہوئی تقریر پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو غالباً ان کا عارضہ قلب ان کی رگ و پے میں کسی نہ کسی صورت میں رینگنا شروع ہو چکا تھا۔ ان کی طبیعت ہرگز ٹھکانے نہ تھی۔ یہاں تک کہ اپنی تقریر پڑھتے پڑھتے وہ بیک بار اس کے دو ورق الٹ گئے۔ اور انہیں اپنی اس غلطی اور بے ربطی کا احساس تک نہ ہوا۔ اور وہ بدستور آگے پڑھتے چلے گئے۔ دعوت ختم ہونے کے بعد جب وہ ایوان صدر واپس گئے' تو اسی رات ان پر نہایت شدید ہارٹ اٹیک ہوا۔

صدر ایوب کی علالت کی خبر ملتے ہی راتوں رات کمانڈر انچیف جنرل یحیٰی خاں اور وزیر دفاع ایڈمرل اے آر خاں نے مل کر ایوان صدر پر قبضہ جما لیا۔ پریذیڈنٹ ہاؤس کا صدر دروازہ بند کر دیا گیا۔ اور گارد کے سپاہیوں کو حکم ہو گیا کہ فوجی عملے کے چند مخصوص افراد کے علاوہ کسی اور شخص کو ایوان صدر میں داخل ہونے کی بالکل اجازت نہ دی جائے۔

اگلی صبح آٹھ بجے کابینہ کے سینئر وزیر خواجہ شہاب الدین کا انٹرویو صدر کے ساتھ پہلے

For more books visit www.4Urdu.com

سے مقرر تھا۔ پونے آٹھ بجے خواجہ صاحب اپنی کار پر جھنڈا لہراتے ایوان صدر کے گیٹ پر پہنچے تو اسے بند پایا۔ گارد کے سپاہیوں نے انہیں باہر ہی باہر سے واپس لوٹا دیا۔ کیونکہ اندر داخل ہونے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ خواجہ صاحب اپنا سا منہ لے کر واپس آ گئے۔ انہوں نے ایک بار مجھے بتایا تھا' کہ یہ صورت حال دیکھ کر معاً انہیں یہ شک گزرا کہ شاید راتوں رات کسی نوعیت کا ناگہانی انقلاب برپا ہو چکا ہے۔ اور اب صدر ایوب معزول ہو کر ایوان صدر میں محبوس یا مقتول پڑے ہیں۔

اس قسم کے شک میں مبتلا ہونے والوں میں تنہا خواب شہاب الدین ہی شامل نہ تھے' جو سینئر وزیر ہونے کی حیثیت سے قریب قریب وزیراعظم کا درجہ رکھتے تھے۔ بلکہ ایوان صدر کی چار دیواری کے اندر بسنے والی مخلوق کے کچھ افراد بھی ایسے ہی وہم و گمان کا شکار تھے۔ اس روز صبح سویرے ایوان صدر کا ایک ڈرائیور محفوظ علی میرے پاس آیا۔ اللہ اسے غریق رحمت کرے۔ مرحوم کئی برس پہلے میرے ساتھ بھی کام کر چکا تھا۔ اس روز وہ گھبرایا ہوا اور کسی قدر پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے نہایت رازداری سے مجھے بتایا' کہ رات بھر ایوان صدر میں قیامت کا سا سماں رہا ہے۔ بیگم ایوب سمیت سب بیٹے اور بیٹیاں غمگین' پریشان اور گم سم ہیں۔ ڈاکٹروں کے آنے جانے کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ کچھ مشینیں بھی لائی گئی ہیں۔ چار دیواری کے سارے گیٹ بند کر کے قفل چڑھا دیئے گئے ہیں۔ جنرل یحییٰ اور ایڈمرل اے آر خاں بار بار آ کر کھسر پھسر کرتے ہیں۔ ڈرائیور نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "صاحب ہمیں تو یہ بھی یقین نہیں کہ صدر صاحب زندہ ہیں یا مر چکے ہیں یا مار ڈالے گئے ہیں۔ ہاں ہم یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ صدر کے مکان پر اب چیف صاحب کا قبضہ ہے۔"

یہ باتیں سن کر میں نے فوراً ایوان صدر ٹیلیفون کیا اور ملٹری سیکرٹری یا کسی اے ڈی سی سے بات کرنا چاہی۔ آپریٹر مجھے پہچانتا تھا۔ اس نے معنی خیز انداز میں بتایا کہ آج سب نمبر مصروف ہیں۔ کسی اور روز ان سے بات کریں۔